بے نام رشتے
علی باقر

'بے نام رشتے' کی کتابت، طباعت اور پروسس
'پرنٹو اینڈ پروسس'
۱۲۱۴۔ مادی پور نئی دہلی ۶۳ کے زیر اہتمام ہوئی۔

بے نام رشتے

علی باقر

مصنف : علی باقر
پتہ : ١٩- دکھشا پورم، جواہرلال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی ١١٠٠٦٧
سرورق : مس تسنیم حسین، عبدالمنان گیاوی
سنِ اشاعت : ١٩٨٧ء
تعداد : ایک ہزار

مطبوعہ : عارض آفسٹ پریس ١٢٣ شہزادہ باغ انڈسٹریل ایریا فیس II دہلی ٣٥
ناشر : سیما پبلیکیشنز A 43-E ڈی۔ ڈی۔ اے فلیٹ، منیرکا، نئی دہلی ١١٠٠٦٧
کتابت : عمار ذکریا، فرمود عالم قاسمی
قیمت : ٤٠ روپے

ملنے کے پتے : سیما پبلیکیشنز A 43-E ڈی۔ ڈی۔ اے فلیٹ، منیرکا، نئی دہلی ١١٠٠٦٧
27- ANDERSON, CLOSE
KIDLINGTON, OXFORD OX5 1ST (ENGLAND)

3501 W. CRAIN
SKOKIE, ILLINOIS 60076 (USA)

60 ONWARD AVE
KITCHNER, ONT N2H 3J9 (CANADA)

ہر لمحہ بدلتی ہوئی زندگی میں
وقت کے بے سُرے نغموں کی دُھن پر
رقص کرتے ہوئے مدہوش لمحات میں
صرف اَلفَاظ ہیں
صداقت بھری مسرّتوں کے اَمیں
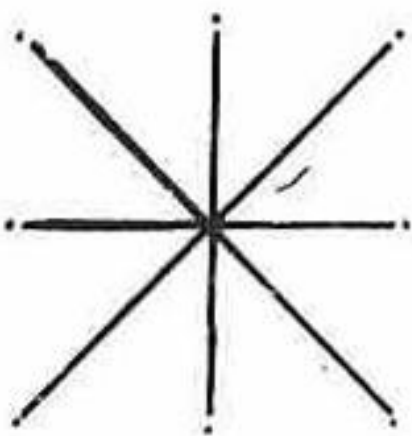
انتساب

اپنے مرحوم والدین سے
مجھے ورثہ میں محبت کے رشتوں کی
بے پایاں دولت ملی ہے
میں نے ان پُرخلوص رشتوں سے ہمیشہ
توانائی پائی ہے۔
اپنے افسانوں کے اس تازہ مجموعہ کو

میں اپنے بھائی بہنوں

قیصر باقر

حسن باقر

نسیمہ تراب

قیصر باقر

سیّد آفتاب (مرحومہ) کے پیار بھرے اور نیک نام
رشتوں سے منسوب کرتے ہوئے
اُن سے
اپنی محبت کا اعتراف کرتا ہوں۔ علی باقر

حسن باقر
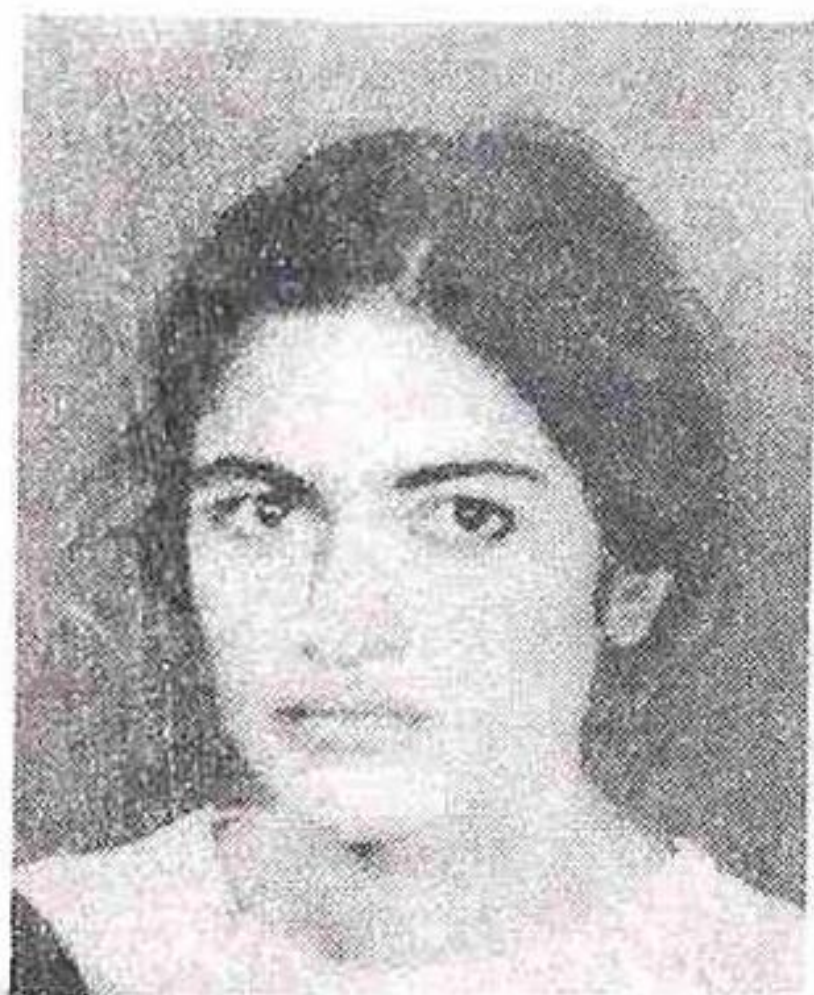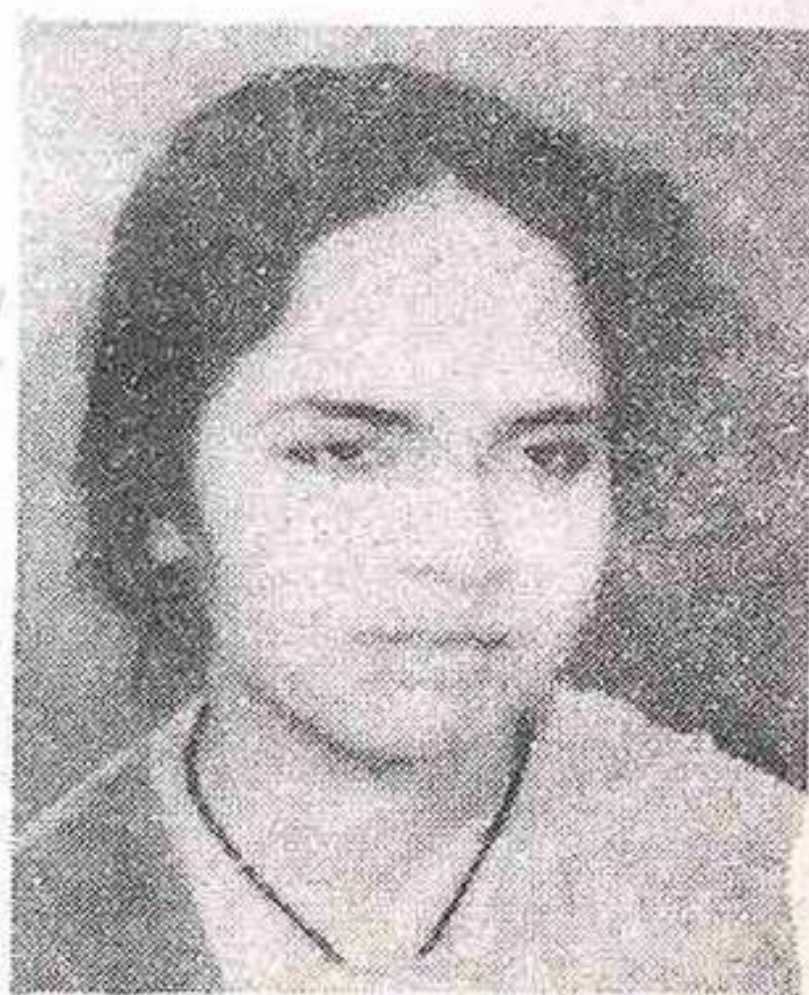
نسیمہ تراب

سیدی آفتاب مرحومہ

اپنا تعارف

زندگی میں پہلا افسانہ میں نے ۲۸ برس لکھا تھا۔ یہ بغیر ترمیم و اصلاح "شمع" میں شائع ہو گیا تھا۔ مجھے اپنی چھپی ہوئی تحریر دیکھ کر بہت خوشی ہوئی تھی۔ ان دنوں میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ آئندہ ۲۸ برس تک میں افسانے لکھتا رہوں گا۔ میرے افسانوں کا کہیں انبار نہیں لگا ہے۔ سال بھر میں صرف دو یا تین لکھ پاتا ہوں۔ انھیں کثیر الاشاعت رسائل میں اس لیے چھپنے کے لیے بھیجتا ہوں کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میرے افسانے زیادہ سے زیادہ لوگ پڑھیں۔

جن دِنوں میں نے لکھنا شروع کیا تھا ملک کو آزاد ہوئے بارہ چودہ برس گذر گئے تھے۔ آزادی کے بعد ملک کے سماجی اور معاشی حالات میں نمایاں تبدیلی نہ پا کر ادیب

اور شاعر ماتم کرتے کرتے تھک چکے تھے۔ مگر اس کے باوجود اُن کی بڑی قدر و منزلت ہوتی تھی۔ ان کی تخلیقات خلوص سے پڑھی جاتی تھیں، بحثیں ہوتی تھیں۔ شاعروں اور ادیبوں کی ایک جھلک دیکھنے، اُن کی باتیں سُننے، ان کے دستخط، آٹوگراف بک پر لینے کے لیے نوجوان لڑکے لڑکیاں کوشش کیا کرتے تھے۔ اس پُر رونق ماحول میں کبھی مجھے خیال بھی نہ آتا تھا کہ خود کو افسانہ نگار کہلواؤں۔ افسانہ لکھنا الگ بات تھی اور ادیب ہونا الگ۔ پھر ان ہی دلوں میں آکسفورڈ چلا گیا جہاں کے عالم دنیا بھر میں مشہور تھے۔ اتنے مشہور پروفیسروں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ اپنی اہمیت کا ہر احساس ختم ہو گیا۔

"خوشی کے موسم" میرے افسانوں کا پہلا مجموعہ تھا۔ یہ ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا تھا۔ ان دلوں میں پندرہ برس لندن میں رہ کر نیا وطن لوٹا تھا اور اردو ماحول کے لیے ترس رہا تھا۔ اس لیے کتاب کی اشاعت بڑی دھوم سے ہوئی۔ کتاب کا سرِ ورق ایم۔ ایف حسین نے بنایا تھا، رسمِ اجراء محترمہ عصمت چغتائی نے کیا تھا۔ رضیہ سجّاد ظہیر صاحبہ مرحومہ نے

اپنے مخصوص ڈھنگ سے میرا ایک افسانہ غالب اکیڈمی نئی دلی میں حاضرین کو سنایا تھا۔ کئی کرم فرماؤں نے تعریفی کلمات بھی کہے تھے۔ ان دنوں یہ سب ہنگامے اچھے لگے تھے۔

میرا دوسرا مجموعہ "جھوٹے وعدے سچے وعدے" ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔ سرورق صادقین صاحب مرحوم نے بنایا تھا اور پیش لفظ پروفیسر قمر رئیس نے ازراہِ محبت لکھ دیا تھا۔ اب مجھے اردو ادب کے نشیب و فراز کا تھوڑا بہت اندازہ ہو چکا تھا۔ لہٰذا اس بار میں نے رسم اجرائے سے پرہیز کیا اور تبصرے کے لیے کتابیں نہیں بھیجیں۔ اردو کلچر میں کتابیں تحفہ میں پیش کی جاتی ہیں، خرید کر نہیں پڑھی جاتیں۔ میں اس رسم کو توڑنا چاہتا تھا۔

اب ۱۹۸۷ء میں میرا تیسرا مجموعہ "بے نام رشتے" شائع ہو رہا ہے اور اس کا پیش لفظ لکھنے کی بدعت میں خود کر رہا ہوں۔ یہ مشورہ مجھے عصمت آپا نے دیا تھا جس کے لیے میں بے حد ممنون ہوں۔ اِس سال کا پہلا دن ہم نے ان کے ساتھ اپنے گھر میں گزارا تھا۔ ادب، ادیبوں اور ناقدوں کے بارے میں ان سے طویل بحث رہی۔ عصمت چغتائی صاحبہ کا اصرار ہے کہ کسی بھی لکھنے والے کو تعارف کرانے والوں کا محتاج نہ ہونا چاہیے۔ اس

کی تحریر اس کی اپنی پہچان ہوتی ہے۔

اردو ادب کی تاریخ میں ستائیس اٹھائیس برس کا عرصہ کچھ زیادہ لمبا نہیں ہے۔ مگر ایک افسانہ نگار کی زندگی میں یہ عرصہ بہت طویل ہے۔ میں نے اس عرصے میں افسانے لکھے مگر "ادب" تخلیق کرنے کی دانستہ کوشش نہیں کی، کسی "ادبی حقیقت" کی تلاش میں "قلم گرداں" نہیں رہا۔ کسی خاص رجحان کا نمائندہ نہیں بننا چاہا، کسی ایک گروہ سے وابستہ نہیں رہا، کسی پرچم کے سائے میں نعرے نہیں لگائے۔ میرے تخلیقی دور کی زیادہ تر میعاد مغربی ملکوں میں بسر ہوئی ہے۔ یہ ایک ایسی جلا وطنی تھی جس کا فیصلہ میں نے خود کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بیرونِ ممالک میں جاکر رہ جانا، کام کرنا فیشن نہیں بنا تھا۔ میرے مسائل اردو افسانہ نگاروں کے مسائل سے الگ تھے، میرے ماحول کے تقاضے الگ تھے، میرے موضوعات نئے تھے۔ غریب الوطن لوگوں کی ابھی کوئی واضح شناخت نہیں بنی تھی۔ زندگی میں داخلی اور خارجی کیفیات کی آنکھ مچولی تو ضرور تھی مگر ان میں ٹھہراؤ نہیں تھا۔ ان ہر لمحہ بدلتے ہوئے حالات کی عکاسی میرا قلم کرتا تھا مگر اس طرح نہیں کہ افسانہ مضمون بن جائے،

کہانی پن علمیّت کے بوجھ تلے دب جائے۔ میں چاہتا تھا کہ اپنے قاری کو وہ نظارہ دکھاؤں جو میں دیکھ رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ جو نئے نئے تجربات میں محسوس کر رہا تھا میرے پڑھنے والے بھی محسوس کریں۔ مَیں اس صنعتی نظام میں انسانی رشتوں کی گتھیوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا ——— میں ان انسانوں کے درمیان تھا جو اپنے معاشرے سے ٹوٹ چکے تھے یا پھر وہ تھے جن کو تاریخ نے نسلی تعصّبات کا شکار بنا دیا تھا۔ ان سب رجحانات اور مطالبات کے باوجود میں یہ دیکھ کر خوش ہوتا تھا کہ ہر ملک میں، ہر مذہب میں، ہر معاشرہ میں، ہر عمر کے مرد اور عورتوں میں ایسے بے شمار لوگ تھے جو انسانی قدروں پر پورا اترتے تھے اور انسانیت کے تقدس کو محسوس کرتے تھے۔

یہ سچ ہے کہ ان تین دہائیوں میں مَیں نے بہت زیادہ افسانے نہیں لکھے ہیں۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ میں نے اپنی سمت کا تعیّن کر لیا ہے، اپنے اظہار اور اُسلوب پر قابو پا لیا ہے۔ میرے افسانوں کے پلاٹ، ماحول، معاشرے، کردار، زبان، فقرے اب میری پہچان بن گئے۔ میرا افسانہ اب میری

شناخت بن گیا ہے۔ شاید اسی وجہ سے عصمت آپا نے مجھ کو ہدایت دی تھی کہ میں اپنا تعارف کسی دوسرے سے نہ لکھواؤں خود ان سے بھی نہیں۔ یہ باتیں میں نے وضاحت کے طور پر لکھ رہا ہوں چونکہ اردو ادب کے موجودہ حالات نہایت تکلیف دہ ہیں۔ لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کے درمیان ناقدوں کی ایک بڑی فوج آکر کھڑی ہوگئی ہے اور ان کی وجہ سے ہر طرف انتشار کا موسم ہے، لڑائی جھگڑے کا موسم ہے، گروپ بندی کا موسم ہے۔ ناقد اصرار کرنے لگے ہیں کہ انھیں اور صرف انھیں ادب کی پہچان ہے، ادیب اور شاعر کی پہچان ہے اور چونکہ اکثر ناقد حضرات بارسوخ ہیں وہ جس کو چاہتے ہیں عزت دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں ذلیل کرتے ہیں۔ یہ لوگ خود ادب تخلیق نہیں کرتے لیکن ادب کی دنیا میں اپنی آواز بلند رکھتے ہیں تاکہ اس آواز کو وہ خود اور اُن کے حواری سُن سکیں۔ جس طرح افسانہ نگار اچھا یا بُرا ہوسکتا ہے اسی طرح نقّاد بھی اچھا یا بُرا ہوسکتا ہے۔ وہ ناقد جو کسی مصلحت یا سیاست کے تحت کسی شاعر یا ادیب کو عظیم یا بے کار ثابت کرتا ہے، دیانتدار نہیں ہے۔

میں اپنا یہ تیسرا مجموعہ "بے نام رشتے" اس لیے شائع کر رہا ہوں کہ کتابی شکل میں افسانہ نگار کی تحریروں کو پرکھنے کا موقع مل جاتا ہے۔ اس مجموعہ میں ایک افسانہ "شراب اور شہد" ہے جو آج سے ۲۳ برس پہلے شائع ہوا تھا اور "پرچھائیاں" بھی ہے جو بالکل تازہ ہے۔ ان کو پڑھ کر میرے تخلیقی سفر کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ صرف آنے والا وقت میرے افسانوں کی صحیح قدر کا تعین کرے گا۔ اتنے لمبے عرصے تک افسانے لکھتے رہنا ہی اپنی جگہ اچھی بات ہے۔ کم از کم یہ تو پتہ چلتا رہتا ہے کہ ذہن اور قلم ابھی تھکے نہیں۔

اِس مجموعہ کے زیادہ تر افسانے طویل ہیں۔ میرے لیے اب مختصر افسانہ لکھنا مشکل ہو گیا ہے۔ میرے موضوعات بدلتے جا رہے ہیں۔ تبدیلیاں مجھ میں بھی آ رہی ہیں اور حالات میں بھی مگر بات کہنے کا انداز ابھی تک سیدھا سادھا ہی رکھا ہے۔ افسانہ کا ایک اہم معیار یہ ہے کہ وہ کہانی ہے اور میں نے ہمیشہ یہی کوشش کی ہے کہ میرے افسانے میں کہانی پن برقرار رہے۔

علی باقر

نئی دہلی ۱۹۸۷

کیکٹس
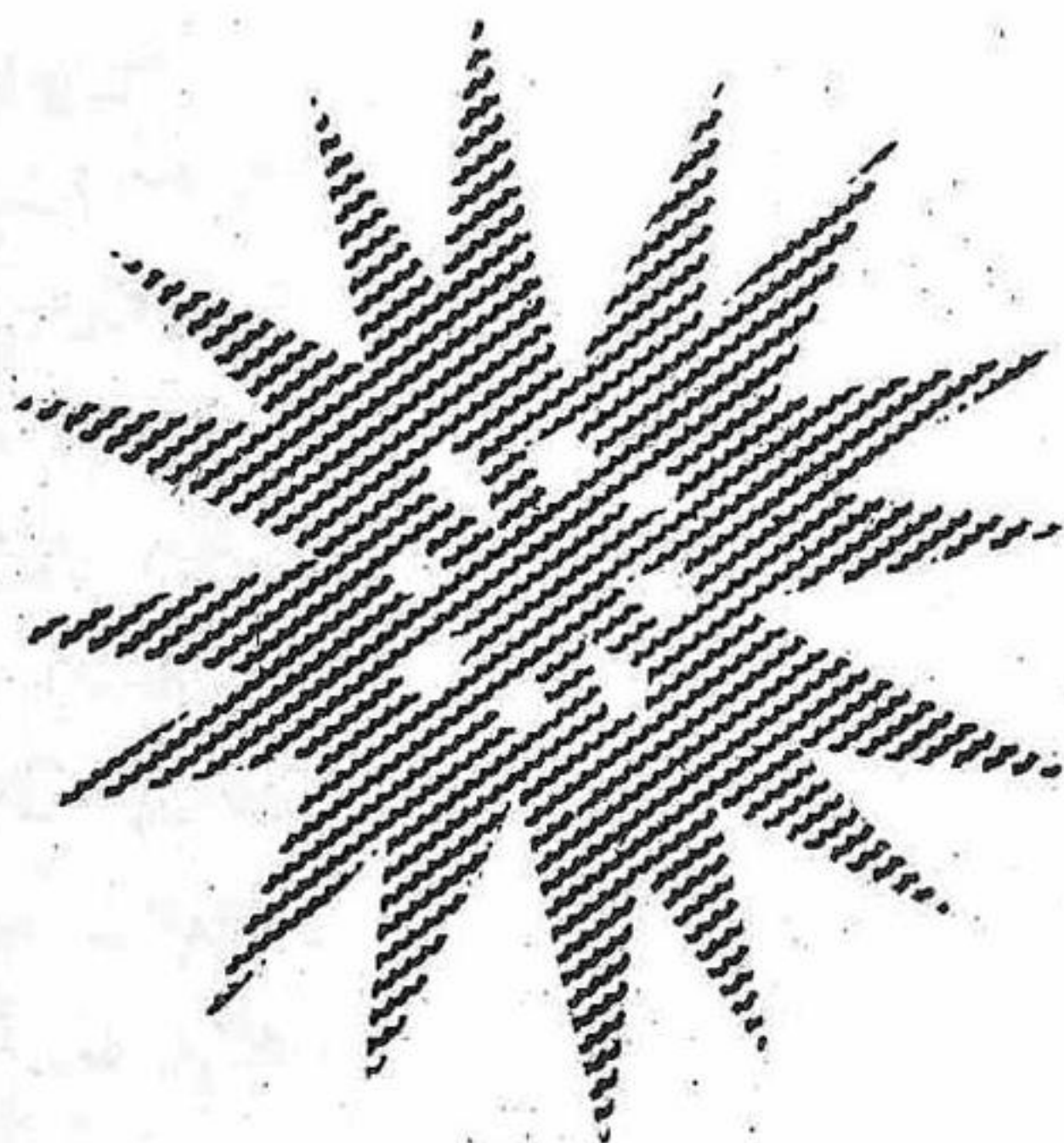
پورے ایک برس پہلے یہی گرمیوں کے دن تھے، یونہی گرم لُو کے تھپیڑے چل رہے تھے، یونہی آسمان اور زمین سے آتی ہوئی تپش کی لہریں مجھ کو جھلسا رہی تھیں اور یونہی املتاس کے درختوں پر نہایت لبھا دینے والی زرد آگ لگی ہوئی تھی اور گل مہر پر ہر طرف شعلے پھولوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ میں اسی آبادی کی تکلیف دہ ویرانی سے ڈرتا ڈرتا، تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا کہ چمپا کے ایک اونچے درخت کی چھاؤں سے نکل کر ایک نوجوان لڑکے نے مجھے اچانک روک لیا تھا۔ اس کا قد لانبا تھا مگر اس کے دبلے پن سے نقاہت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ اس نے کئی دن سے شیو بھی نہیں کیا تھا۔

"کیا آپ نے یہیں کہیں ایک بہت ہی خوب صورت لڑکی کو روتے ہوئے دیکھا ہے؟" اس نوجوان کے سوال سے میں چونک گیا تھا۔ اس کا لہجہ بہت سنجیدہ تھا۔

"کوئی بھی لڑکی روتے وقت خوب صورت دکھائی دیتی ہے۔ تم کس

لڑکی کی بات کر رہے ہو؟" میں نے اس سے گفتگو کا آغاز اس خیال سے کر دیا کہ بات چیت کرنے سے وہ مجھ پر حملہ کا خیال چھوڑ دے گا۔ عمر اور رکھ رکھاؤ کے اعتبار سے آج کل میں پڑھنے والوں کے مقابلہ میں پڑھانے والے گروپ کا آدمی نظر آتا ہوں۔ عمر بڑھنے سے آدمی خواہ مخواہ معتبر نظر آنے لگتا ہے۔ دو انسانوں کے درمیان گفتگو ایک طرح کا رشتہ ہے۔ مگر شاید اتنا مضبوط بھی نہیں کہ خطرہ کے وقت ڈھال بن جائے۔

"میں اس حسینہ کی بات کر رہا ہوں جس کی آنکھیں بہت بڑی ہیں اور جس کے بال بہت لمبے ہیں اور جنھیں وہ ایک ڈھیلے سے جوڑے میں باندھے رہتی ہے۔ اس کی آنکھیں گل مہر کے پھولوں کی طرح کھلکھلا کر ہنستی رہتی تھیں، مگر اب وہ شوخ آنکھیں ......" اتنا کہتے کہتے اس نوجوان کی آواز جیسے اس کے حلق میں پھنس گئی تھی وہ خاموش ہو گیا۔

"تم نے اس بچاری کو رلایا کیوں؟" میں آہستہ آہستہ چلنے لگا اور چمپا کے درخت کی چھاؤں سے ہٹ کر دھوپ میں آگیا۔ اس کیمپس میں داخل ہوتے وقت گیٹ پر ہی پولیس انسپکٹر نے مجھے یقین دلایا تھا کہ آج اس علاقے میں کسی کی جان اور مال کو خطرہ نہیں تھا۔ "ہم نے شرارت کرنے والوں کو گرفتار کر لیا ہے، جیل میں ٹھونس دیا ہے۔ ان کی تو اب ضمانت بھی نہیں ہو سکتی۔ ایسے جھگڑے فساد کو روکنے کے لیے سختی کی ضرورت ہے، سختی کی۔" پولیس انسپکٹر نے یہ جملہ کچھ اتنے نپے تلے انداز میں کہے تھے کہ لگتا تھا کہ یہ الفاظ ادا کرنے کی بہت مشق ہو چکی ہے۔

"کیا آپ میری دردناک کہانی سنیں گے، سنیں گے نا؟" نوجوان

نے اب میرا راستہ باقاعدہ روک لیا تھا۔ اور میں یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نوجوان کے لہجہ میں درخواست چھپی ہوئی تھی یا دھمکی۔ میں نے اپنی خیریت اسی میں سمجھی کہ چپ چاپ اس کی باتیں سنوں۔

"جب سے میں تمھارے اس کیمپس میں داخل ہوا ہوں کہانیاں ہی سن رہا ہوں ——— پولیس انسپکٹر کی کہانی، چوکیدار کی کہانی، گھروں کی کھڑکیوں کے ٹوٹے ہوئے شیشوں کی کہانی، پتھروں سے پچکی ہوئی کاروں کی کہانی ——— اور پھر اس سناٹے کی کہانی جو اس جلتی ہوئی دھوپ سے زیادہ تیز اور جھلسا دینے والا ہے۔ تم بھی اپنی کہانی سناؤ، لیکن یوں اس طرح میرا راستہ نہ روکو، میرے ساتھ چلتے رہو۔" میں دراصل اندر ہی اندر سے بہت ڈرا ہوا تھا مگر بات اس طرح کر رہا تھا کہ خوف ظاہر نہ ہو۔ خوف اعتراف کر لینا بہادری ہے۔ مگر اکثر یہ اعتراف وقت گزر جانے کے بعد ہی کیا جاتا ہے موقع واردات پر نہیں۔

"نہیں میں آپ کے ساتھ نہیں چلوں گا۔ آپ کو یہیں رکنا پڑے گا۔ بلکہ میرے ساتھ تھوڑا پیچھے کی طرف بھی چلنا ہو گا۔" اس نوجوان نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کی انگلیاں پسینے سے بھیگی ہوئی تھیں۔ دلی کی تیز گرمی میں بھی اتنا پسینہ کسی کو نہیں آتا۔ ان انگلیوں کی گرفت سخت تھی۔

ہم دونوں چند قدم پیچھے کی طرف لوٹ گئے اور چمپا کے اسی درخت کے نیچے پہنچ گئے جہاں وہ نوجوان مجھ سے ملا تھا۔ چمپا کے کچھ پھول دھوپ میں زیادہ ہی سفید نظر آ رہے تھے۔ وہ نوجوان مجھ سے دھیمی آواز میں کہنے لگا۔

"وہ، دیکھئے وہاں، پہلی منزل پر گیتا کا کمرہ ہے۔ وہ جہاں منڈیر پر

گملے میں کیکٹس کا ننھا سا پودا لگا ہے اور الگنی پر ایک سفید رومال ٹنگا ہے۔"

میں نے پانچ چھ فٹ اونچی دیوار کے پرے دیکھا جس پر رنگ برنگے ٹوٹے ہوئے شیشوں کے چھوٹے بڑے ٹکڑے اس طرح لگائے گئے تھے کہ باہر سے کوئی دیوار پھلانگ کر اندر نہ آسکے۔ اور شاید اندر سے باہر نہ جاسکے۔ پھر میں نے سرخ اینٹوں سے بنے ہوئے پورے ہوسٹل پر نظر دوڑائی جس کی پہلی منزل پر گیتا کا کمرہ تھا۔ گیتا شاید لمبے لمبے بالوں والی، بڑی بڑی آنکھوں والی حسینہ کا نام تھا۔ اس شاندار اور نئی عمارت والے ہوسٹل میں سب کمروں کی طرح گیتا کا کمرہ بھی سنسان پڑا تھا۔ میرے قریب کھڑے ہوئے نوجوان کے روحانی کرب سے اندازہ ہوتا تھا کہ عمارت کا سونا پن صرف اس وجہ سے ہی نہیں تھا کہ ہوسٹل میں ان دنوں کوئی نہیں رہتا تھا۔ جب کسی مکان چھوڑ کر جانے والے اس کے در و دیوار کو محبت سے یاد نہیں کرتے تو شاید ان کا سونا پن اور بڑھ جاتا ہے۔

" الگنی پر وہ سفید رومال جو گرم ہوا سے ہل رہا ہے، میرا ہے۔" نوجوان نے یہ انکشاف کچھ اس یقین سے کیا کہ جیسے یہ بات مجھے ہی سے معلوم ہونی چاہیے تھی۔

"تم نے یہ رومال گیتا کو اس لیے دیا ہوگا کہ وہ اپنی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو پونچھ ڈالے۔" مجھے رفتہ رفتہ گیتا اور اس نوجوان کی کہانی میں دلچسپی پیدا ہونی شروع ہوگئی تھی۔ اور پتہ نہیں کیوں مجھے یہ خیال آیا کہ گیتا کے آنسو بہت موٹی موٹی بوندوں کی طرح ہوں گے۔ بڑی آنکھوں سے صرف بڑے

آنسوؤں کا نکلنا ضروری تو نہیں ہے پھر بھی میں نے یہی سوچا تھا۔

"نہیں۔ میں نے پچھلی بار یہ رومال گیتا کو دیا نہیں تھا بلکہ اس رومال میں ایک پتھر لپیٹ کر گیتا کی طرف پھینکا تھا اور پتھر کے اطراف میرا رومال دیکھ کر گیتا کی آنکھوں سے فوراً آنسو بہنا شروع ہو گئے تھے۔ اس نے سوچا ہوگا کہ ایسے وقت جب اس کیمپس میں ہر طرف پتھراؤ ہو رہا تھا میں نے ——— اس کے اپنے اجیت نے ——— دوسرے اور شرارتی لوگوں کی طرح پتھر پھینکنے میں حصہ لیا تھا۔" اس کی یہ بات سن کر مجھے لگا جیسے اب وہ نوجوان خود آنسو بہانے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔

"اجیت اگر تم سے گیتا ناراض ہوتی تو وہ یہ رومال تمھیں یہ رومال لوٹا دیتی۔ یوں الگنی پر لٹکا کر نہ چلی جاتی۔" میں نے نوجوان کو سمجھایا۔

"نہیں صاحب، یہ بات نہیں ہے۔ آپ دراصل گیتا کو جانتے ہی نہیں ہیں، وہ بہت ذہین اور حساس لڑکی ہے۔ اس رومال کو الگنی پر لٹکا کر اس نے میری اور اپنی دوستی کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کا اعلان کیا ہے۔" اُس نے مجھ سے بحث کرنا شروع کر دیا۔

"بھئی اجیت، اب تم پہیلیوں میں بات کرنے لگے ہو۔ دھوپ بہت تیز ہے اور مجھے اپنا کام جلدی سے ختم کر کے اس سنسان کیمپس سے نکل کر بہت دور اپنے گھر لوٹ جانا ہے۔ میرے گھر والے تو اس خیال سے ہی خوفزدہ تھے کہ میں اس لڑائی جھگڑے کے زمانے میں تمھاری یونیورسٹی آنے والا تھا۔" میں نے پھر ہوسٹل کے سامنے والی سڑک پر چلنا شروع کر دیا، اور اجیت سے کہا "دنیا کی کوئی عورت چاہے وہ کتنی بھی خوب صورت کیوں نہ ہو، پرخلوص اور

سچی محبت کو ٹھکرانے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔"

"میں آج بھی گیتا سے سچی محبت کرتا ہوں۔ مگر اس پتھر کے بعد جو میں نے اس کی طرف پھینکا تھا اس کو میری محبت پر کس طرح یقین آسکتا ہے۔ آپ مجھے بتلائیے۔" اجیت نے مجھ سے سوال کیا۔

"اگر یہی بات ہے تو تم گیتا کو بھول جاؤ، اس ویران کیمپس کو چھوڑ دو، یہ سمجھ لو کہ اور چیزوں کی طرح تمھاری اور گیتا کی محبت بھی عارضی تھی، فانی تھی ——— یہ املتاس کے پیلے پیلے پھول جو آج اس طرح بھبھک کر اپنی بہار دکھلا رہے ہیں چند دن میں مرجھا جائیں گے، گر جائیں گے۔" میں نے اپنے تجربات کا نچوڑ اجیت کے سامنے رکھ دیا۔ ایک انجان شخص کی الجھنوں کو سلجھانا کس قدر آسان کام ہوتا ہے۔

"پہلی بار جب میں نے گیتا کو یہ رومال دیا تھا تب میں اُسے جانتا تک نہیں تھا ——— میں اور گیتا بس میں جن پتھ سے ساتھ ساتھ سوار ہوئے تھے ——— اور جب وہ کنڈکٹر کو اپنا کرایا دے رہی تھی تو میں نے دیکھا کہ اس کے داہنے ہاتھ سے خون بہہ رہا تھا ——— میں نے جھٹ سے اپنا رومال جیب سے نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا تھا کہ آپ اپنا خون پونچھ لیجیے۔" اجیت نے گیتا سے اپنی پہلی ملاقات کا حال کچھ اس طرح سنایا جیسے ننھے بچے رٹی ہوئی نظم کو گا گا کر اجنبیوں کو اپنے ماں باپ کے اصرار پر سناتے ہیں اجیت نے اپنی بات جاری رکھی۔"گیتا نے رومال لیتے ہوئے اپنی پلکیں اٹھا کر مجھے اتنے خلوص سے دیکھا کہ مجھے اس وقت پتہ چل گیا تھا کہ مجھے ایسی لڑکی مل گئی

تھی جس سے میں محبت بھی کر سکتا تھا۔ اور محبت کا اظہار بھی کر سکتا تھا ــــــــ اگر گیتا مجھے اتنی زیادہ پیاری نہ لگتی تو شاید میں اس سے یہ درخواست نہ کرتا کہ وہ رومال مجھے بعد میں لوٹا دے ــــــــ بات یہ ہے صاحب کہ مجھے ہمیشہ یہی بتلایا گیا ہے کہ اگر رومال لوٹایا نہ جائے تو دوستی ختم ہو جاتی ہے۔" اجیت کی آواز کم ہوتے ہوتے بالکل رک گئی تھی۔ اور وہ اپنے خیالوں میں گم میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا اور اب ہم لوگ ہوسٹل کے قریب سے دائیں طرف مڑ کر چوڑی سڑک پر آ گئے تھے۔ جس کے دونوں طرف املتاس کے پیلے پھولوں سے لدے ہوئے درخت تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ایک دوسرے کی شاخوں کو چھو رہے تھے۔ اس سڑک کی بے پناہ خوبصورتی کی یاد، املتاس کے پیلے پھولوں پر پڑی ہوئی دھوپ کی چمک کی یاد مجھے بعد میں کئی بار آئی۔

"تو گیتا نے تمہارا رومال لوٹانے کے بجائے کیکٹس کے گملے کے اوپر الگنی پر ٹانگ دیا۔" میں ان دونوں کی کہانی میں الجھتا رہا۔ مگر کہانی دلچسپ ہوتی جا رہی تھی۔

"رومال دوسرے ہی دن گیتا نے لوٹا دیا تھا، اُس کو دھو کر استری کر کے اور ایک اچھے سے سینٹ کی مہلک میں بسا کر۔ میری اور گیتا کی دوستی آہستہ آہستہ بہت گہری ہو گئی تھی۔ میں جب بھی گیتا سے ملتا

مجھے بہت گہرے سکون کا احساس ہوتا۔ گیتا چاہے دس منٹ کے لئے آتی اس کی کسی بات سے یہ پتہ نہ چلتا کہ اس کو واپس لوٹنے کی جلدی ہوتی ——— شروع شروع میں گیتا کے اور میرے دوست ہم دونوں کو ساتھ دیکھ کر چھیڑنے لگے تھے۔ اور بعد میں تو ایسا ہو گیا تھا کہ لوگ ہمیں ایک ساتھ نہیں دیکھتے تو سوالوں کی بوچھاڑ ہو جاتی۔" اجیت کی آواز میں اس کے اور گیتا کے اس رشتہ کی گہرائی کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ جس کو کئی برس گزر جانے کے بعد بھی اچھے اچھے ناموں سے یاد کیا جا سکتا ہے۔

"پھر تمہاری دونوں کی دوستی کیوں ٹوٹ گئی؟" املتاس کی چھدری چھاؤں میں اس نوجوان کی داستان سنتے سنتے میں تھوڑی دیر کے لیے گرمی کی شدت کو، دھوپ کی تمازت کو، اس علاقے کے سناٹے کو بھول گیا تھا۔ سچی محبت خود ایک شراب ہوتی ہے، اس کو پینے والے شراب بن جاتے ہیں۔ اس سننے والے شراب کے نشہ کو اپنے احساس پر طاری ہوتا ہوا محسوس کر سکتے ہیں۔ اس کو دیکھنے والے مدہوش ہو جاتے ہیں۔

"گیتا مجھ سے کہا کرتی تھی کہ اجیت کمار وریا گر تم مجھ سے محبت کرو تو سب کے سامنے کرنا چھپ چھپ کر نہیں ——— میں تمہاری محبّت محسوس کرنا چاہتی ہوں، راہ چلتے ہوئے، کلاس میں لیکچر سنتے ہوئے، سوتے ہوئے، جاگتے ہوئے ——— اور وہ کہتی تھی کہ اجیت اگر تمھیں کبھی

کسی سے رقابت کا احساس ہو تو اس کو چھپانا نہیں، گُڑھنا نہیں۔ رقابت کے جذبہ کا بھی اظہار کر دینا۔" اجیت نے مجھ کو اپنی محبوبہ کی کہی باتیں سُنائیں۔

"اور لگتا ہے اجیت کمار ورما کہ تم نے گیتا کی باتوں میں آ کر کسی رقیب سے اپنی جلن کا اظہار اس طرح کر دیا کہ گیتا ناراض ہو گئی"۔ مجھے لگا کہ ان کی محبت کی گُتھی آخر کار میری سمجھ میں آ چکی تھی۔ "تم فکر نہ کرو اجیت۔ اس قسم کی لڑائیاں محبّت کے متوالے ایک دوسرے سے کرتے رہتے ہیں۔ تمھارا رومال تم کو واپس مل جائے گا۔"

رومال ملنا تو ایک طرف ابھی تو یہی پتہ نہیں کہ ہماری یونیورسٹی کب کھلے گی؟ جانے کتنے مہینے لگ جائیں گے اس میں ——— اور اب تو گیتا بھی اپنے گھر چلی گئی ہو گی۔ اس کی پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ تو پورا ہو ہی چکا تھا۔ صرف زبانی امتحان رہ گیا تھا ——— آپ نے سچ کہا کہ مجھ کو جلاپے کا احساس بہت زیادہ تھا اور اگر میں اپنے جلاپے کا اظہار الفاظ سے کرتا تو شاید بات اتنی نہیں بڑھتی۔ چونکہ الفاظ کا وزن نہیں ہوتا، وہ ہوا میں اڑتے ہوئے چلے جاتے ہیں، کھو جاتے ہیں ——— مگر پتھر تو کہیں نہیں جاتے۔" اجیت نے یہ جملہ کچھ اس طرح ادا کیا جیسے گھنے اور الجھے ہوئے بالوں میں کنگھا کیا جاتا ہے، رکتے رکتے، ڈرتے ڈرتے۔

"کہیں تم نے گیتا ہی کو تو پتھر نہیں مار دیا تھا؟" مجھ کو اچانک خیال آیا کہ یونیورسٹی میں پڑھنے والی تعلیم یافتہ لڑکی کبھی ایسے مرد سے محبت نہیں کر سکتی جس کو مار پیٹ کی عادت ہو، جو خود کو صنف نازک سے افضل سمجھتا ہو۔

"نہیں جناب نہیں۔" اجیت نے فوراً احتجاج کیا۔ "میں ان مردوں میں سے نہیں ہوں جو کمزور عورتوں پر ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ ہوا یوں تھا کہ اس یونیورسٹی کے چند استادوں اور چند لڑکے لڑکیوں میں ٹھن گئی تھی مجھے اور گیتا کو تو پتہ بھی نہیں کہ اس آپسی رشتہ میں اتنے تناؤ کی کیفیت کہاں سے پیدا ہو گئی تھی۔ گیتا کو کہیں نوکری کی امید تھی۔ جس کے لیے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری جلد سے جلد حاصل کرنا تھا۔ اس کا مقالہ ٹائپ ہو رہا تھا۔ ہم لوگ کہیں بیٹھ کر ساتھ مقالہ پڑھتے اور غلطیاں درست کرتے اور جب تھک جاتے تو کہیں ٹہلنے چلے جاتے ــــــ کسی پہاڑی پر بیٹھ کر سیاہ آسمان میں ہر طرف بکھرے ہوئے تاروں کا چمکتا ہوا حسن دیکھتے، باتیں کرتے ــــــ یونہی ادھر ادھر کی۔ گیتا کی آواز رنگین پھولوں کے مہکتے ہوئے جسم کی طرح ریشمی ہے۔ میں اس کی آواز سنتا رہتا، مہکی ہوئی ملائم آواز ــــــ تین دن پہلے شام کے وقت میں اور گیتا کینٹین کے سامنے بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ کہ ایک کرخت آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ 'تم لونڈیوں کی چوما چاٹی ہی کرتے رہو گے یا کچھ کرو گے بھی۔' اور میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو ایک لڑکا چند دوستوں کے ساتھ ہمارے پاس کھڑا تھا۔ اس لڑکے کو میں نے پہلے کبھی یونیورسٹی

میں نہیں دیکھا تھا۔ صورت شکل سے وہ طالب علم بھی نہیں لگتا تھا۔ 'کیا کرنا ہے؟' میں نے زمین پر بیٹھے بیٹھے پوچھا تھا جس پر وہ لڑکا اپنے ساتھیوں کی طرف مڑ کر کہنے لگا۔ 'لو یہ میم کا یار پوچھتا ہے کہ کیا کرنا ہے۔ ابھی مجنوں مہاراج، انقلاب آ گیا ہے، لڑائی شروع ہو چکی ہے۔ اٹھو اور اپنے دشمنوں سے بدلہ لو، اور یہ کہہ کر لڑکے لڑکیوں کی وہ ٹولی بھاگتی ہوئی پروفیسروں کے گھروں کی طرف چل دی۔ پھر نعرے لگنا اور پتھر پھینکنا شروع ہو گئے۔ گیتا نے یہ سب کچھ دیکھا اور سنا تو پیالی زمین پر رکھ دی۔ اور اٹھ کر چلنے لگی۔ میں نے پوچھا، 'گیتا تم کہاں جا رہی ہو؟' اور اس نے دوڑتے ہوئے جواب دیا، 'اپنے پروفیسر کو بچانے' میں بھی اٹھ کھڑا ہوا اور پانچ چھ منٹ تک سوچتا رہا کہ کیا کروں اور پھر گیتا کی تلاش میں دوڑنے لگا، مجھے دوڑتے دیکھ کر کچھ لڑکے اور لڑکیاں بھی ساتھ ہو لیے، پتہ نہیں کس طرح سب ہی کے ہاتھ میں پتھر آ گئے —— مجھے گیتا اور اس کے پروفیسر کی دوستی کبھی اچھی نہیں لگتی تھی۔ کئی بار گیتا سے کہا بھی تھا کہ وہ اس بوڑھے اور چالاک آدمی کو اپنے زیادہ قریب نہ آنے دے۔ اس شام جب میں نے گیتا کو اپنی جان خطرہ میں ڈال کر مجھے نظر انداز کر کے پروفیسر کو بچانے کے لیے جاتے ہوئے دیکھا تو میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ جب میں پروفیسر کے گھر کے سامنے پہنچا تو کھڑکی میں سے دیکھا کہ گیتا ان کے قریب کھڑے کچھ راز و نیاز کی باتیں کر رہی تھی۔ میں اور زیادہ کڑھ گیا۔ اور اپنے رومال میں ایک پتھر لپیٹ کر پروفیسر اور گیتا کی جانب زور

سے پھینکا اور بڑی کھڑکی کا شیشہ ایک جھناکے سے ٹوٹ گیا۔ میں نے پتھر کو اپنے رومال میں اس لئے لپیٹ دیا تھا کہ گیتا کو پتہ چل جائے کہ پتھر پھینکنے والا کوئی اور نہیں اجیت کمار ورماہی تھا۔ خود گیتا کی خواہش تھی کہ میں محبت اور رقابت کا اظہار سب کے سامنے کھلم کھلا طور پر کروں۔" اجیت خاموش ہو گیا۔

"یہ بات سچ ہے تو پھر گیتا کو برا نہیں ماننا چاہیئے تھا۔" میں نے کہا اور گیتا کے خالی کمرے کے سامنے الگنی پر گرم ہوا میں لہراتے ہوئے اس سفید رومال کے بارے میں سوچنے لگا جس کے حاشیوں پر نیلے رنگ کی دھاری بنی ہوئی تھی اور جو تھوڑی دیر پہلے اجیت نے مجھے دکھلایا تھا۔ اور جو چلتی ہوئی بس میں اجیت نے گیتا کو پہلی ملاقات میں اس لیے دیا تھا کہ وہ اپنے ہاتھ سے بہتے ہوئے خون کو پونچھ لے۔

"گیتا کے پروفیسر کے گھر پر میں نے ہی سب سے پہلے پتھر پھینکا تھا اور شیشہ ٹوٹنے کی آواز کے ساتھ وہ سب لڑکے لڑکیاں جو کینٹین کے سامنے سے اٹھ کر میرے ساتھ بھاگتے ہوئے آئے تھے انھوں نے پتھر مار مار کر دروازے کی کھڑکیوں کے شیشے توڑ ڈالے، کچھ لوگ گھر کے پیچھے کی طرف چلے گئے اور پروفیسر صاحب کی ہرے رنگ کی بڑی سی کار توڑ دی۔ ——— میں نے گیتا اور اس کے پروفیسر کو پتھروں کی بوچھار سے سہم کر کھانے کی میز کی آڑ میں چھپے ہوئے دیکھا، ڈرائنگ روم کے دروازے کا بڑا شیشہ چکنا چور ہو چکا تھا ——— میں یہ تباہی دیکھ کر اپنے ہوسٹل کی طرف چلنے لگا اور پھر میں نے سب ہی گھروں میں چھپے ہوئے، ڈرے

ہوئے عورتوں اور بچوں کو دیکھا۔" اجیت ان واقعات کو یاد کرتے کرتے خاموش ہو گیا۔

یونیورسٹی کے حالیہ فسادات کا تذکرہ میں اخباروں میں پڑھ چکا تھا مگر اجیت کی زبانی آنکھوں دیکھا حال سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہونے لگے تھے۔ تشدد کرنے والے زیادہ دیر تک خوش نہیں رہ سکتے۔

"پھر کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"پولس کی لاریاں آچکی تھیں۔ لڑکے لڑکیوں کو حراست میں لیا جا رہا تھا۔ میں نے سرخ پھولوں والے بوگن ولا کی جھاڑی کے پیچھے چھپے ہوئے دیکھا کہ گرفتار ہونے والوں میں گیتا بھی شامل تھی ——— میں نے اس کا نیلے رنگ کا شلوار سوٹ فوراً پہچان لیا تھا۔ گیتا کے ہاتھ میں میرا رومال تھا۔" اجیت نے بتلایا۔

"گیتا کو کیوں گرفتار کیا گیا، اس نے تو کسی پر پتھر نہیں پھینکا تھا۔ بلکہ الٹا اپنے پروفیسر کو بچانے کی کوشش کی تھی۔" میں نے سوال کیا۔

"گیتا نے شاید مجھے سزا دینے کے لیے خود کو گرفتار کروایا تھا ——— صاحب آپ یقین کیجئے کہ ہم دونوں کا اس پتھراؤ سے کوئی تعلق نہ تھا۔" اجیت کی آواز میں سچائی اور خلوص تھا۔

"گیتا کے پروفیسر سے تمہاری ذاتی رقابت تو اس جھگڑے والے دن بھڑک اٹھی تھی۔" میں نے اجیت کو یاد دلایا۔

"جی ہاں یہ بات ضرور تھی۔ میں ایک دن بعد گیتا سے ملنے جیل گیا مگر اس نے کوئی بات نہیں کی۔ اس کی بڑی بڑی کالی آنکھوں میں گہرے دکھ

کی لکیریں لہرا رہی تھیں، دکھ جو بھروسہ ٹوٹنے سے ہوتا ہے۔ جتنی دیر میں وہاں کھڑا رہا وہ خاموش رہی اور روتی رہی۔" اجیت کی آنکھوں سے بھی اب باقاعدہ آنسو بہنے لگے تھے۔ کسی کے ساتھ زیادتی کرنا آسانی سے برداشت نہیں ہوتا۔

"اجیت مجھے بہت دیر ہو گئی ہے ——— اگر میرے سپرد دفتر کا یہ ضروری کام نہ ہوتا تو ان دہشت ناک حالات میں تمھاری یونیورسٹی میں آتا بھی نہیں ——— تمھیں گیتا کے ہوسٹل کے سامنے کھڑے رہنے سے کیا ملے گا، یہاں سے چلے جاؤ ورنہ ہو سکتا ہے کہ پولس ہی تم کو پکڑ کر لے جائے۔" میں نے اجیت کو سمجھایا جو اپنی غلطی پر پشیمان بھی تھا اور گیتا کی دی ہوئی سزا سے ٹوٹ کر بھی رہ گیا تھا۔

"نہیں صاحب میں یہیں رہوں گا ——— مجھے یہاں گیتا کے کمرے کے سامنے کھڑے رہنا اچھا لگتا ہے ——— میں جب بھی گیتا کو دیوار کی آڑ سے آواز دیتا تھا۔ وہ مسکراتی ہوئی، بھاگتی ہوئی، بالوں میں کنگھا کرتی ہوئی آجاتی اور کہتی 'ٹھہرو اجیت میں ابھی نیچے آتی ہوں' اور اس کی آواز کے خوشبو دار پھول صرف میرے لیے کھل اٹھتے تھے۔" اجیت کی باتوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس وقت بھی گیتا کی آواز سن رہا تھا اور جیسے وہ گزرے ہوئے دنوں میں کہی گئی باتیں نہ تھیں بلکہ گیتا کی باہیں تھیں جو اجیت کو گلے لگانے کے لیے اٹھی ہوئی تھیں۔

"کیا گیتا کو وہ کیکٹس بھی تم نے ہی دیا تھا؟" میں نے چلتے چلتے اجیت سے پوچھا۔

"نہیں وہ پودا گیتا کے پروفیسر صاحب نے اس کو دیا تھا۔ پروفیسر صاحب کو طرح طرح کے کیکٹس جمع کرنے کا بے حد شوق ہے۔" اجیت کے جواب سے لگا جیسے محبت اور رقابت کے جذبوں نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ پتھراؤ سے شیشے ٹوٹ سکتے ہیں۔ مگر رقیب سے عداوت باقی رہ جاتی ہے، نفرت کو مٹانے کے لیے نہ جانے کتنے بھاری پتھروں کی ضرورت ہوتی ہوگی، نہ جانے اور کتنے گھروں کو تباہ کرنا پڑے گا مجھے یقین تھا کہ میرے جانے کے بعد اجیت کسی اور راہ گیر کو اپنی کہانی سنائے گا۔

گیتا جب جیل سے نکل کر ہوسٹل کے اس پہلی منزل کے کمرے میں اپنے کپڑے اور اپنی کتابیں لے کر وطن لوٹ جانے کے لیے آئی ہوگی تب ہی اس نے اجیت کا رومال الگنی پر لٹکایا ہوگا وہ جانتی ہوگی کہ رومال واپس نہ لوٹانے سے اجیت کے دل میں کتنے وہم پروان چڑھیں گے۔

○

یہ پچھلی گرمیوں کی بات ہے جب اس یونیورسٹی میں طالب علموں اور پروفیسروں کے خوب صورت اور نازک رشتوں میں بھونچال آگیا تھا اور تباہی اس علم کی عبادت گاہ پر اس طرح مسلط ہوگئی تھی جیسے پھر کبھی یہ یونیورسٹی آباد نہ ہو سکے گی۔ مگر آج جب اتفاق سے میں ان ہی املتاس اور گل مہر کے دہکتے ہوئے زرد اور سرخ

پھولوں کے نیچے سے گزرتا ہوا اس چمپلے کے درخت کے نیچے پہنچا جہاں اجیت کمار ورما نے اپنی اور گیتا کی محبّت سے لبریز مگر دکھ بھری کہانی سُنائی تھی تو یہ یونیورسٹی پھر سے آباد ہو چکی ہے۔ استاد اور شاگرد اپنے ازلی رشتہ میں پھر سے سرشار ہیں۔ میری نظریں بے اختیار گیتا کے کمرے کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔ وہاں الگنی پر اب کوئی سفید رومال ہواہیں نہیں جھول رہا ہے۔ البتہ منڈیر پر رکھے ہوئے گملے میں کیکٹس کا سبز پودا اور بڑا ہو گیا ہے۔
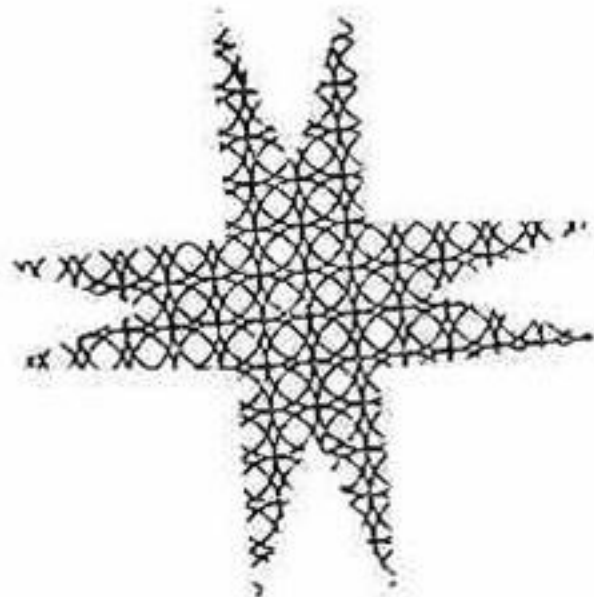
فاصلے

پچھلے سال سردیوں کی ایک شام کو جب میں آفس سے چلنے لگا تو ہیلن نے میری طرف ایک عمدہ کالی چھتری بڑھاتے ہوئے کہا "آپ اسے لیتے جائیے مسٹر کھانا، نہیں تو آپ بھیگ جائیں گے۔ ہیلن کی آواز میں ہمدردی تھی۔

میرا نام دراصل کھنّہ ہے، مگر جب سے ہندوستان چھوڑا ہے شاید ہی کوئی مجھے ٹھیک نام سے مخاطب کرتا ہو۔ ملک سے باہر رہنے میں یہ بڑی خرابی ہے کہ اکثر خود اپنا نام اجنبی بن جاتا ہے "نہیں ہیلن ــــ تمہارا شکریہ۔" میں نے اس سے خلوص سے کہا "مجھے تو انگلستان آئے ہوئے چھ برس ہو گئے، مگر میں نے آج تک چھتری استعمال نہیں کی۔"

"کبھی نہیں؟" ہیلن نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔ ہیلن جب بغیر کسی خاص وجہ کے مسکراتی تھی تو خواہ مخواہ شریر نظر آنے لگتی۔ لڑکیوں میں شرارت دعوت بھی ہو سکتی ہے اور دھوکا بھی۔ ہیلن ہمارے دفتر کے ری سیپشن پر کوئی چھ مہینے

سے کام کرتی تھی۔ روز صبح کو جب میں اپنے نام آئے ہوئے خط لینے وہاں جاتا ہوں تو ہیلن سے ایک دو باتیں ضرور ہو جاتی ہیں صبح صبح اس کا مسکراتا چہرہ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ وہ نیوزی لینڈ کی رہنے والی ہے۔ اس کا قد بوٹا سا ہے۔ آنکھیں بڑی بڑی اور گہری نیلی۔ بال کالے اور لمبے، جنہیں وہ روز نئے انداز سے سنوارتی ہے۔ کبھی اس کے بال کھلے ہوئے اس کی کمر پر جھولتے رہتے ہیں تو کبھی جُوڑے کی شکل میں سجے ہوتے ہیں۔ اس کی عمر پچیس چھبیس برس ہو گی، مگر اس کی آواز کی طرح اس کے چہرے میں بھی بچپن سا تھا۔ ہمارے دفتر میں کام کرنے سے پہلے وہ بیلے ڈانسر تھی۔ اب بھی اس کے چلنے کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ باکمال بیلر تیا رہی ہو گی ——— ہیلن کی گردن بڑی خوب صورت تھی۔ تنی تنی سی، جس روز وہ اپنے بال جُوڑے کی طرح بناتی تو ایک راج ہنس کی طرح نظر آتی جو کسی خاموش جھیل میں بڑی متانت اور تمکنت کے ساتھ تیرتا رہتا ہے۔

"میں ایک شرط پر یہ چھتری لینے تیار ہوں۔" میں نے راج ہنسوں کا خیال دماغ سے ہٹاتے ہوئے ہیلن سے کہا۔

"کیا شرط ہے وہ؟" ہیلن پھر مسکرا رہی تھی۔ میں نے دیکھا اس کے بال جوڑے کی شکل میں بندھے ہوئے تھے۔ ایک سفید راج ہنس گردن اٹھائے خاموش جھیل پر تیرتا پھر میری طرف بڑھنے لگا۔

"یہی کہ جس شام دفتر سے نکلتے وقت بارش ہو، تم میرے ساتھ اس چھتری کے نیچے چلو گی ——— قریب کے بس اسٹینڈ تک

یا ٹیوب اسٹیشن تک"۔ مجھے یہ شرط پیش کرتے وقت اپنی بے باکی پر خود تعجب ہوا کہ کتنی آسانی سے میں نے اس کو اپنا دوست بننے کی کھلی دعوت دے دی تھی۔

"مگر میرے پاس تو اپنی چھتری موجود ہے"۔ لڑکیاں بعض وقت جان بوجھ کر ان باتوں کے لئے انکار کر دیتی ہیں جن کے لئے خود ان کا دل چاہتا ہے۔ ہیلن غالباً فوراً دعوت قبول کرنا نہیں چاہتی تھی۔

"تو پھر یہ چھتری کس کی ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"اسے کئی مہینے پہلے نہ جانے کون دفتر میں چھوڑ گیا تھا اور آج تک لینے نہیں آیا۔ میں اکثر دیکھتی ہوں کہ آپ کا سر بھیگا ہوتا ہے۔ کسی دن سردی لگ جائے گی آپ کو"۔ یہ بظاہر انجان رہنے والی لڑکیاں کس قدر غور سے ہر چیز دیکھتی ہیں، پسند اور ناپسند کرتی ہیں۔

تمہارا شکریہ ہیلن کہ میرا خیال رکھا ——— لیکن تمہیں میری شرط منظور نہیں تو میرا بھیگتے رہنا ہی اچھا ہے"۔ میں چلنے لگا، آہستہ آہستہ، ناراض ناراض۔

"اچھا ٹھہریئے، میں ابھی آئی"۔ اس نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد ہیلن میرے ساتھ ساتھ فٹ پاتھ پر چل رہی تھی کھلی ہوئی چھتری کے نیچے، بارش کے مہین مہین قطرے چھن رہے تھے۔ ہیلن نے بتایا کہ اس کا فلیٹ قریب کے بڑے پارک کی دوسری جانب تھا۔ شام کو اکثر وہ پیدل ہی گھر لوٹتی تھی۔ ایک چھتری کے نیچے جب دو انسان ساتھ چلنے کی کوشش کرتے ہیں تو خواہ مخواہ قریب آجاتے ہیں، جسم سے جسم چھونے لگتا ہے۔

ہاتھ سے ہاتھ مس ہو جاتے ہیں۔ پچھلے سال لندن میں سردیوں میں بھی کافی بارش ہوئی تھی۔ شام کو اکثر رِم جھم ہوتی رہتی اور ہر بھیگی ہوئی شام کو ہیلن کی اور میری دوستی کچھ اور بڑھ جاتی۔ وہ مجھ سے میرے بارے میں سوال پوچھتی رہتی اور میں اس کو سب باتیں اس طرح بتاتا رہتا جیسے بچے اپنے نئے دوستوں کو سارے کھلونے دکھاتے ہیں۔

"آپ آخر چھتری کیوں استعمال نہیں کرتے تھے؟" ایک دن پارک میں اس نے چلتے چلتے رک کر پوچھا۔ میں آگے بڑھ گیا تھا۔ پانی کے قطرے اس کے چہرے پر گرنے لگے تھے۔ میں نے لوٹ کر اس کو چھتری کی اوٹ میں لے لیا۔

"دیکھو کتنے فائدے ہیں چھتری نہ ہونے میں۔ مثال کے طور پر تم سے دوستی اسی وجہ سے ہوئی"، میں نے ہیلن سے کہا۔

"اگر چھتری کا بہانہ نہ ہوتا تو شاید میں آپ سے دوستی کرنے کی کوئی اور ترکیب نکالتی"، اس نے ہنس کر کہا۔ رفتہ رفتہ ہماری بے تکلفی بڑھتی جارہی تھی۔ دل میں چھپی باتیں کہنے میں آسانی بڑھتی جارہی تھی۔

"جس دن میں پہلی بار لندن آیا تھا، اس روز بھی بارش ہو رہی تھی ــــــــ اس طرح رِم جھم نہیں جیسی آج ہے، بلکہ اچھی خاصی موسلا دھار بارش۔ اپنا سامان ہوسٹل میں رکھ کر جب میں ایک ریستوراں میں کھانا کھانے گیا تو مجھے وہاں سب لوگ بھیگے بھیگے، پریشان پریشان سے لگے ــــــــ جب میں ریستوراں سے باہر نکل رہا تھا تو آواز آئی "ہیلو ہینڈسم"۔ میں نے گھوم کر دیکھا، ایک لڑکی کسی اور نوجوان کو پکار رہی تھی جو تیزی سے سڑک پار

کر رہا تھا۔ شاید اس نے لڑکی کی آواز نہیں سُنی۔ میں نے کہا " کیا آپ مجھ سے مخاطب ہیں ؟"

" اوہ نو !" اس انگریز لڑکی نے مذاق کے لہجے میں مجھ سے کہا "آپ اپنے کو سمجھتے کیا ہیں ؟"

" حسین ، جوان ، خوب صورت !" میں نے بھی مسکراتے ہوئے اس کو جواب دیا۔ وہ اپنی چھوٹی سی رنگین پھول دار چھتری کھول چکی تھی۔ میں بارش کی زد میں آنے سے ہچکچا رہا تھا۔

" اچھا حسین ، جوان ، خوب صورت صاحب آپ میری چھتری کے نیچے آجائیے اور جلدی سے بتائیے کہ کہاں جا رہے ہیں ؟"

میں نے چھتری اس کے ہاتھ سے لے کر تھام لی اور ہم ہوسٹل کی جانب چلنے لگے۔

"میں آج ہی ہندوستان سے آیا ہوں۔ یہ میری پہلی انگریزی برسات ہے۔" میں نے معذرت کے لہجے میں کہا۔

" پتہ نہیں آپ لوگ اپنی اتنی اچھی آب و ہوا چھوڑ کر یہاں کیوں آجاتے ہیں ! یہ موسم تو صرف بطخوں کے لئے بنا ہے۔ آپ اپنی اس سانولی رنگت کا خیال رکھئے گا ـــــــ کہیں یہ یہاں کی بارش میں دھل کر مدھم نہ پڑ جائے۔" اس کے بال سنہرے تھے جو میرے چہرے کو چھو رہے تھے۔ ایک جوان ، خوب صورت ، چینی کی سفید گڑیا کو اپنے اتنے قریب پا کر مجھے جھرجھری سی آگئی۔

"آپ کو سردی لگ رہی ہے کیا؟" اس اجنبی حسینہ نے مجھ سے پوچھا۔
"نہیں اصل بات یہ ہے کہ زندگی میں آج پہلی بار ایک لڑکی میرے اتنے قریب آئی ہے ــــــ وہ بھی پردیس میں!" میں نے اسے سچ سچ بتا دیا۔ اَن جانے لوگوں سے سچ بولنے میں اکثر کوئی تکلف نہیں ہوتا۔

"کیوں، کیا ہندوستان میں لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے سے نہیں ملتے جُلتے؟" ہیلن نے قصے کے بیچ میں ٹوک کر مجھ سے سوال کیا۔ اس کا فلیٹ آگیا تھا۔ اپنے پرس سے چابی نکال کر اس نے دروازہ کھولا، چھوٹی سی میز پر رکھی ہوئی ڈاک دیکھی اور پھر ہم دونوں موٹے قالین سے ڈھکے ہوئے زینہ پر بے آواز چلتے ہوئے پہلی منزل پر پہنچ گئے۔ ہیلن نے کمرے میں پہنچ کر ہیٹر جلا دیا۔

"ہندوستان بہت بڑا ملک ہے ہیلن ہر قسم کے لوگ رہتے ہیں وہاں۔ میں جس ماحول میں رہا ہوں۔ وہاں لڑکے لڑکیوں میں ایک طرح کی جسمانی دوری ہی رہی۔" میں نے اس کو سمجھایا۔

"اچھا پھر آگے کیا ہوا؟" ــــــ ہیلن نے پوچھا۔ وہ لندن میں میرے آنے کے بعد کے پہلے دن کے کارنامے کے بارے میں پوچھنا چاہ رہی تھی شاید اس اجنبی حسینہ سے میری دوستی کے بارے میں جاننا چاہ رہی تھی۔
"پھر کیا ہوتا ــــــ میرا ہوسٹل آگیا تھا میں نے اس خوبصورت لڑکی کا شکریہ ادا کیا کہ لندن میں میری پہلی شام کو اس نے خوش گوار بنا دیا تھا۔ میں نے پوچھا کہ اس کا نام کیا ہے تو وہ کہنے لگی "نام جان کر کیا کروگے؟

ایک ہفتہ ہوا میری منگنی کو ــــــ یہ دیکھو انگوٹھی " اس نے اپنا ہیرے کی انگوٹھی والا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ اس کا ہاتھ نرم تھا ، اور سرد ــــــ غالباً بارش کی وجہ سے "

" بہت چاہتی ہوں گی آپ اپنے منگیتر کو ؟ " میں نے اس سے پوچھا۔

" واہ ! تم نئے نئے ہو نا اس ملک میں ! تھوڑے دنوں میں سمجھ جاؤ گے کہ لڑکیاں اس ہیرے کی انگوٹھی کے لئے کیا کیا جتن کرتی ہیں۔ اچھا اب میں چلتی ہوں۔ خدا کرے جس مقصد کے لئے تم اپنے ملک کی اتنی اچھی آب و ہوا کو چھوڑ کر یہاں آئے ہو ، اس میں کامیاب رہو ، ہیرے کی انگوٹھی بہت سوچ سمجھ کر خریدنا اور اپنی سانولی رنگت کا خیال رکھنا " وہ مجھے ہوسٹل کے دروازے تک چھوڑ کر واپس چلی گئی۔ میں اندر جانے ہی والا تھا کہ اس کی آواز نے مجھے چونکا دیا " ذرا ایک منٹ کے لئے ادھر آنا " وہ ہوسٹل کے دروازے کے قریب دیوار سے لگی کھڑی تھی " میں نے سوچا کہ لندن میں تمہاری پہلی شام کو اور خوش گوار بنا دوں " اپنے دونوں ہاتھ اس نے میرے گلے میں اس طرح حمائل کیے کہ اس کی چھتری ہمارے سروں سے بارش کو روکتی رہی۔ اور پھر میرے ہونٹوں کا اس نے ایک طویل بوسہ لیا " لندن آنا مبارک ہو۔ یہ تمہارا پہلا پیار ہے نا۔ تم اس پیار کی لذت کو کبھی نہیں بھولو گے۔ اور جب تم اس لذت کو یاد کرو گے تو شاید مجھے بھی یاد کر لو ــــــ کتنی خود غرض ہوں میں ؟ ہے نا ؟ "

اس سے پہلے کہ میں اسے جواب دیتا وہ جا چکی تھی۔ اس واقعہ کے بعد آج تک میں اس سے کبھی نہیں ملا۔ میں ہیلن کے ہونٹوں کی طرف دیکھ رہا تھا جو ہیٹر کی

سرخ روشنی میں کچھ اور زیادہ دلآویز لگ رہے تھے۔ وہ بڑے غور سے میری باتیں سن رہی تھی "ہیلن آج سے جب بھی ہم ایک دوسرے کو پیار کریں گے تو اس پیار کو یاد رکھیں گے جو ہم نے زندگی میں پہلی بار کیا تھا" ہیلن نے آنکھیں بند کر لیں، اور اپنا چہرہ میری طرف بڑھا دیا۔ اس کے ہونٹوں کی نرمی میں اس رات بڑی پیاری سی خود سپردگی سی تھی۔

"تم ابھی آنکھیں بند کیے کس کو یاد کر رہی تھیں؟" میں نے ہیلن سے پوچھا۔

"پیٹر کو ——— وہ اور میں ایک ساتھ ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے۔ چھٹی کے دن ہم اکثر ساتھ سمندر میں تیرنے جاتے، سیپیاں چنتے۔ میں شاید چودہ برس کی ہوں گی۔ جب ایک شام سمندر کے کنارے، گیلی ریت پر کھڑے ہوئے، ڈوبتے ہوئے سورج کے سامنے پیٹر نے مجھے اچانک پیار کر لیا تھا" ہیلن کی آنکھیں اس پیار کی یاد سے ایک بار پھر بند ہو گئیں ———

"جب میں نیوزی لینڈ میں تھی تو ہر شام سورج ڈوبتے وقت اس واقعہ کو یاد کرتی تھی۔ اکثر پیٹر میرے ساتھ ہوتا اور اس یاد کو بڑے خلوص سے تازہ کر دیتا۔ مگر لندن میں تو بادل کے سوا کچھ نظر نہیں آتا اور پھر پیٹر یہاں سے بارہ ہزار میل دور ہے" ہیلن کی آواز میں ان پیاروں کی گونج شامل تھی جو اس کے پہلے عشق کے محافظ تھے۔

ایک صبح دفتر میں جب میں اپنے خط لینے ریسپشن ڈیسک پر گیا تو ہیلن نے کہا "آپ سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔ شام کو ملئے گا۔"

"مگر ہیلن، آج تو اتنی اچھی دھوپ نکلی ہے۔ بارش شاید بالکل نہ ہو۔"

ہیلن میری بات سن کر مسکرانے لگی ——— وہی شریر سی مسکراہٹ۔ لیکن اتنے مہینے کی دوستی کے بعد میں جان گیا تھا کہ اس مسکراہٹ میں کتنی یگانگت تھی، کتنا خلوص تھا۔

شام کو جب ہم پارک میں سے گذر رہے تھے تو اتنے دن میں پہلی بار مجھے خیال آیا کہ درختوں کی ٹہنیوں پر پتے نہیں تھے۔ بارش میں نظر اُٹھا کر دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ ہیلن کے فلیٹ میں ہم کافی دیر تک خاموش بیٹھے کافی پیتے رہے۔ میں انتظار کر رہا تھا کہ ہیلن وہ باتیں چھیڑے جن کے لئے اس شام اس نے خاص طور سے مجھے بلایا تھا۔ مگر وہ بہت سنجیدہ سی تھی۔ اس کی آنکھیں اور گہری نیلی ہو گئی تھیں۔

"ہیلن، کوئی دو سال پہلے میں کچھ ہفتوں کے لئے جرمنی گیا تھا۔" میں نے خاموشی توڑنے کے لئے باتیں کرنا شروع کیں۔ "وہاں ہیمبرگ میں دریا کے کنارے ایک ڈانس ہال میں ایک لڑکی کے ساتھ میں کافی دیر تک رقص کرتا رہا۔ ڈورا نام تھا اُس کا۔ لانبا سا قد، جسم عام جرمن لڑکیوں کی طرح گداز۔ نرم سنہرے بال باریک فریم کی عینک کے پیچھے سے اس کی ذہین آنکھیں چمکتی رہتیں۔ وہ شاید کسی اسکول میں بچوں کو پڑھاتی تھی۔"

"میرا دوست پیٹر بھی اب عینک لگانے لگا ہے ——— موٹے فریم کی عینک۔" ہیلن نے کہا۔

"وہ ہماری ملاقات کی تیسری شام تھی۔ جب میں ڈورا کے ساتھ

رقص گاہ سے باہر نکلا تو اچھی خاصی بارش ہو رہی تھی۔ ڈورا نے چھتری کھولی اور ہم سڑک پر چلنے لگے۔ میں نے پیش کش کی کہ میں چھتری تھام لوں مگر ڈورا نے انکار کر دیا کہ بارش اس کے چہرے پر گرتی ہے تو اسے بُرا لگتا ہے۔"

"پلیٹر بھی یہی کہتا ہے۔ عینک کے شیشے بھیگ جائیں تو دیکھنے میں مشکل ہوتی ہے۔" ہیلن نے مجھے بتلایا۔ میری باتیں سن کر ہیلن کو کچھ اپنے پر گزرے ہوئے بلتے جلتے ہوئے واقعات یاد آنے لگے تھے۔

"میں نے ڈورا سے وعدہ کیا کہ ہر بوند جو اس کے چہرے پر گرے گی اس کو میں اپنے ہونٹوں میں جذب کر لوں گا۔ یہ سن کر ڈورا نے اپنی چھتری بند کر لی اور بارش میں بھیگتی رہی۔"

ہیلن ہنسنے لگی "اگر تم مجھ سے یہ وعدہ کرتے تو شاید میں بھی یہی کرتی ——— پھر کیا ہوا؟"

"جب ڈورا بہت زیادہ بھیگ گئی۔ بارش اور بوسوں سے ——— تو کہنے لگی کہ اس نے فیصلہ کیا ہے کہ کرسمس تک کسی نہ کسی طرح اپنی شادی رچا لے گی۔ اور اچانک ہمبرگ میں مجھے لندن کی اپنی پہلی شام یاد آ گئی اور انگریز حسینہ کی یہ نصیحت بھی کہ ہیرے کی انگوٹھی بہت سوچ سمجھ کر خریدنا۔ میں نے ڈورا سے کہا "میں اپنا پتہ چھوڑ جاؤں گا۔ مجھے تم اپنی شادی میں بلانا نہ بھولنا۔" مجھے بھیگی ہوئی ڈورا کا مایوس چہرہ یاد آ گیا۔

"کیوں آپ کو ڈورا پسند نہیں تھی کیا؟" ہیلن نے پوچھا۔

"نہیں یہ بات نہیں ——— وہ جوان تھی اور خوب صورت بھی۔

مگر جس دوستی کی بنیاد صرف جسمانی قربت کی خواہش ہو، وہ دوستی دیرپا نہیں ہو سکتی۔ محبّت کی اصل کسوٹی دراصل دوستی کی جدائی ہے۔ دو جسموں کا ملاپ عارضی طور پر محبت کی سی کیفیت پیدا کر دیتا ہے، اور بس۔" میں نے اپنے اور ڈورا کے بارے میں کئی بار سوچا تھا اسی لئے اپنے جذبات کا تجزیہ ہیلن سے کہہ دینا نسبتاً آسان تھا۔

"میں اگلے ہفتے سے دفتر میں کام کرنا بند کر رہی ہوں۔" ہیلن نے تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد مجھ سے کہا۔ "مجھے ایک بیلے کمپنی کے ساتھ یورپ کے مختلف ملکوں میں گھومنے کا کام مل گیا ہے۔ چھ مہینے بعد میں پھر نیوزی لینڈ چلی جاؤں گی۔ آپ سے مل کر پیٹر کی یاد اور شدت اختیار کر گئی ہے۔ ہر بار جب ہم پیار کرتے ہیں تو مجھے سمندر کی موجوں میں ڈولتے ہوئے ایک بڑے سے گول سرخ رنگ کے سورج کی مدھم گرمی یاد آنے لگتی ہے۔"

میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ سوچتا رہا، پچھلے کئی ہفتے سے میں اکثر جوہریوں کی دکانوں کے سامنے رک کر ہیرے کی انگوٹھیوں کو چپکے چپکے دیکھتا رہا تھا اور سوچتا رہا تھا کہ ہیلن کو ان میں سے کون سی انگوٹھی اچھی لگے گی۔ مگر اب اس بات کا ذکر ہیلن سے کرنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ پیٹر کی جدائی اور میری دوستی نے اسے نیوزی لینڈ لوٹنے پر مجبور کر دیا تھا، جہاں سورج ہر شام غروب ہونے سے پہلے سمندر کے ساحل پر ان دونوں کو ڈھونڈتا ہے۔

اس رات میں جب ہیلن کے فلیٹ سے چلنے لگا تو میں نے اس کی

دی ہوئی چھتری اسے لوٹا دی۔

"اسے آپ ہی رکھئے۔ آپ کو اس کی ضرورت پڑے گی نا؟" ہیلن افسردہ سی تھی ——— کچھ ایسی افسردگی جو کسی مرے ہوئے شخص کی چیزیں آپس میں تقسیم کرتے وقت اس کے عزیزوں کو ہوتی ہے۔

"نہیں، ہیلن ——— اب اس چھتری سے مجھے کیا فائدہ؟ میرا دل بھی چاہتا ہے کہ ہندوستان لوٹ جاؤں۔ اور ہمارے ملک میں یا تو بارش ہوتی ہی نہیں اور جب ہوتی ہے تو اتنی زور کی کہ باڑھ آجاتی ہے اور گاؤں کے گاؤں بہہ جاتے ہیں۔"

مگر اس رات جب میں اپنے گھر لوٹ رہا تھا تو ہمیشہ کی طرح لندن میں بارش ہو رہی تھی اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ کوئی ہیرے کی انگوٹھی پہنے چھتری کے سائے میں، ان بے برگ و بار درختوں کے نیچے میرے ساتھ ساتھ چلتا ہو اس طرح کہ ہمارے جسم چھو جائیں اور احساس نہ ہو۔
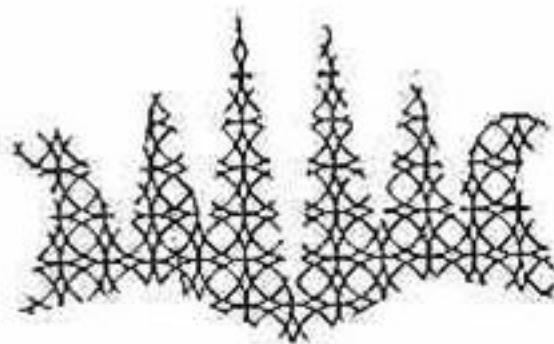
راز

وینس کے چھوٹے سے ایرپورٹ پر سلونیا اور پرکاش سے رخصت ہو کر لندن کے لیے روانہ ہوتے وقت میں نے ان دونوں سے کہا تھا کہ اگلی بار ہم تینوں وِرونا کے پرانے گرجے سینٹ اناستیزیا میں ملیں گے۔ اس وقت مجھے یہ پتہ نہیں تھا کہ ہم تینوں کی ملاقات اس گرجے میں اتنی جلد ہو جائے گی۔ ایرپورٹ پر سلونیا کی بڑی بڑی کالی آنکھوں میں جیسے آنسوؤں کی چمک تھی یا شاید مجھے لگا تھا کہ وہ مجھ سے جدا ہوتے وقت آب دیدہ سی ہو گئی تھی یا اس وقت وینس میں گرنے والی ہلکی ہلکی پھوار کا اثر رہا ہو۔ سلونیا کے کالے بال سلک کے ایک سرخ اسکارف کے نیچے سے جھانک رہے تھے۔ پرکاش نے اپنے داہنے بازو سے سلونیا کے دونوں کاندھے چھپا رکھے تھے۔ سرخ اور پیلے بڑے بڑے پھولوں کی بغیر آستین کی فراک کے اندر سلونیا کا مرمریں جسم چھپا ہوا تھا یا شاید اس تنگ سوتی لباس سے اور زیادہ نمایاں

ہو رہا تھا۔ سلونیا کے اس پرکشش جسم کی خاموش پرستش میں ایک عرصہ سے کر رہا ہوں۔

وینس سے روم اور روم سے لندن سفر کرتے ہوئے میں سلونیا، پرکاش اور اپنے بارے میں بہت تفصیل سے سوچتا رہا سلونیا لوویلو کوئی ایک برس پہلے انگریزی زبان سیکھنے کے لیے لندن آئی تھی۔ وہ اطالوی ہے اور ورونا کی رہنے والی ہے۔ قدیم زمانے کے یونانیوں اور آج کل کے اٹلی کے باشندوں کی طرح سلونیا کے نزدیک حب الوطنی کے معنی صرف اپنے شہر سے محبّت کرنا ہے۔ لندن میں سلونیا ایک برس کے قریب رہی مگر ایک دن بھی خوش نہ رہ سکی۔ بادلوں سے ڈھکے ہوئے لندن میں ایک دن وہ پرکاش کی کار میں اگلی سیٹ پر اس کے ساتھ بیٹھی تھی اور میں پیچھے کی سیٹ پر تھا۔ سلونیا کا سر سیٹ پر کچھ اس طرح ٹکا ہوا تھا کہ اس کی خوبصورت گردن کا خم اور زیادہ نمودار ہو گیا تھا۔ میرے دل نے بے اختیار چاہا تھا کہ سلونیا کی سفید تنی ہوئی گردن پر جھک کر اپنے ہونٹ رکھ دوں۔ سلونیا کہہ رہی تھی شاید پرکاش سے یا مجھ سے "تم نے کبھی لندن میں آسمان کو دیکھا ہے ـــ چاہے بارش ہو یا دھوپ نکلی ہو ـــ چاہے دن میں بادل ہوں یا رات میں تاریکی ہو ـــ یہ انگریزی آسمان جذبات سے عاری ہوتا ہے ـــ فرماں بردار بچوں کی طرح۔ اس ملک میں یہ آسمان مجھے ذرا بھی اچھا نہیں لگتا،" سلونیا نے اپنی لانبی پلکوں والی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ وہ کسی اور آسمان کے خواب دیکھ رہی تھی۔

"سلونیا،" پرکاش نے کار چلاتے ہوئے کہا تھا "تمہیں تو لندن میں کوئی چیز اچھی نہیں لگتی،" "نہیں ایسا تو نہیں ہے" سلونیا سیٹ پر سنبھل کر بیٹھ گئی تھی "اگر میں

لندن نہ آتی تو پرکاش تم سے ملاقات کیسے ہوتی مجھے تم بہت اچھے لگتے ہو اور تم لندن میں رہتے ہو۔"

پرکاش کی تعریف سلونیا کی زبان سے سن کر میرے دل میں ہزاروں نشتر سے اتر گئے تھے۔ پرکاش میرا سب سے قریبی دوست ہے اور ہماری دوستی ہماری عمر جتنی لمبی ہے میں اس کی تعریف دنیا کے ہر آدمی سے سن سکتا تھا مگر سلونیا سے نہیں۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اس ڈر سے کہیں کہ کہیں پرکاش اور سلونیا مڑ کر میری آنکھوں میں میری اندرونی کیفیات نہ پڑھ لیں۔

"سلونیا۔ کیا تمہارا شہر لندن کے مقابلے میں زیادہ خوبصورت ہے؟" میں نے تھوڑی بعد اس سے پوچھا تھا۔ سلونیا کو انگریزی اتنی اچھی آتی تھی کہ اکثر میں اور پرکاش سوچتے کہ وہ زبان سیکھنے کے لیے لندن کیوں آئی تھی۔

"ہاں بہت زیادہ خوبصورت ہے۔ ورونا اٹلی کا سب سے زیادہ خوبصورت شہر ہے۔ کم از کم میں تو یہی سمجھتی ہوں۔ ہمارے شہر پر چھایا ہوا آسمان اور آسمانوں سے زیادہ نیلا ہے۔ ہماری عمارتیں اطالوی معاشرت کی عظمت کا ثبوت ہیں، ہمارے عالموں نے مغربی تہذیب کو سنوارا ہے، ہماری شرابیں زیادہ نشہ آور ہیں، ہمارے پھل زیادہ رس بھرے ہیں، ہماری آب و ہوا سب سے زیادہ خوشگوار ہے، ہمارا سنگ مرمر بت تراشوں کے لیے دعوت ہے۔ ہمارے شہر کے بیچوں بیچ آہستگی سے بہتا ہوا ایک خوبصورت دریا ہے اور شہر کے اطراف ہری بھری پہاڑیوں کے پیچھے سے جھانکتے ہوئے اونچے اونچے پہاڑ ہیں۔ ورونا رومیو اور جولیٹ کا شہر ہے محبت کے دیوانوں کا شہر ہے۔" سلونیا کی آواز میں اس کے شہر کا سارا

حسن اُتر آیا تھا۔

"محبّت کے دیوانے ہر جگہ، ہر ملک میں ہوتے ہیں"، میں نے سلونیا کی تقریر سننے کے بعد کہا تھا۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ سب قدیم شہروں کے قریب سے دریا بہتے ہیں اور ہر شہر میں لوگ محبّت کرتے ہیں۔ بعض پرکاش کی طرح خوش قسمت ہوتے ہیں کہ ان کا محبوب بھی ان سے محبت کرتا ہے اور بعض میری طرح ہوتے ہیں جو محبت کے اظہار کی آزادی نہیں رکھتے۔ اپنے قریب ترین دوست کی محبوبہ سے کس طرح محبت جتلائی جاسکتی ہے۔ میں اپنی محبت پر یقین رکھتا ہوں مگر حالات نے مجھے اس یقین کے قلعہ میں گرفتار کر دیا ہے۔

میں یہ سب سوچتا ہوا وینس سے روم پہنچ چکا تھا۔ روم کے ایرپورٹ پر جہاز بدلو تب بھی سامان کی جانچ پڑتال ہوتی ہے مجھے یونیفارم پہنے سکیورٹی افسر جو میری اور میرے سامان کی تلاشی لے رہے تھے، بہت خراب لگے۔ میں سلونیا، پرکاش اور اپنے بارے میں سوچنے کے لیے تنہائی چاہتا تھا۔ دوسرے جہاز سے جب میں لندن کے لیے روانہ ہوا تو اپنی سیٹ پر حفاظتی پیٹی لگا کر پھر سے اپنے خیالات میں کھو گیا۔

لندن میں پرکاش اور میں ایک بڑے ہسپتال میں ساتھ کام کرتے ہیں۔ پرکاش میرا بہت پرانا دوست ہے اسکول میں ہم دونوں ساتھ تھے، لکھنؤ میڈیکل کالج میں ساتھ تھے۔

لندن دو برس پہلے ساتھ ساتھ آئے تھے۔ ایک سال تک تو ہم نے الگ ہسپتالوں میں کام کیا تھا مگر پھر مجھے بھی پرکاش کے ہسپتال میں ملازمت مل گئی تھی۔ اس ہسپتال میں آنے سے پہلے پرکاش کی ملاقات سلونیا نووبلو سے ہو گئی تھی اور جب میں سلونیا سے

ملا ان دونوں کی دوستی ایک تناور درخت کی طرح ہو گئی تھی زمین سے اوپر جتنی اس کی شاخیں پھیلتی جا رہی تھیں زمین کے اندر اتنی ہی اس کی جڑیں ایک دوسرے سے مل کر اور مضبوط ہوتی جا رہی تھیں۔

مجھے سلونیا سے محبت پہلی ہی ملاقات میں ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک نے میرے دل میں سینکڑوں چراغ جلا دیئے تھے اور اس کی آواز کی موسیقی نے ان چراغوں کو آہستہ آہستہ رقص کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ سلونیا کی آنکھیں بڑی کالی اور چمک دار ہیں اس کی ناک اٹھی ہوئی اور ستواں ہے۔ اس کے سرخ ہونٹ ترشے ہوئے اور متوازن ہیں۔ اس کا جسم شفاف اور سفید ہے۔ اگر وہ کبھی ساکت ہوتی تو لگتا کہ وہ نوجوان لڑکی نہیں مائیکل انجلو کا تراشا ہوا سنگ مرمر کا مجسمہ ہے۔ وہی مجسموں جیسی دلآویزی، وہی رنگت، وہی سینے اور باہوں کی گدازی وہی پرستش کروانے کی خاموش پکار۔ مجھے پرکاش نے شروع میں ہی بتلا دیا تھا کہ وہ سلونیا کو بے حد چاہتا ہے اور وہ اس اطالوی مجسمے کو ہمیشہ کے لیے اپنانا چاہتا ہے۔ یہ سب جانتے ہوئے بھی میں دل کڑا کر کے سلونیا کے جسم پر اکثر ایک چبھتی ہوئی نظر ڈال لیتا اور سلونیا جیسے میری نگاہوں میں چھپی ہوئی دعاؤں کا مفہوم سمجھ لیتی، اس کی آنکھوں کی چمک ایک قسم کے خوف میں بدل جاتی۔ اس کی کالی پلکیں شرم سے جھک جاتیں۔ کبھی کبھی میری آنکھوں میں یہ سوچ کر آنسو آ جاتے کہ سلونیا سے میں پرکاش سے پہلے کیوں نہیں ملا۔

پرکاش جب بھی سلونیا سے شادی کی بات کرتا تو وہ ہنس کر ٹال دیتی۔ میں دل ہی دل میں ان دونوں کی شادی ٹلنے سے خوش تھا۔ بھابی پر اس قسم کی نگاہ ڈالتے ہوئے میرے گناہ کا بوجھ اور بڑھ جاتا۔ ایک رات ٹرافلگر اسکوائر کے نیلے حوض کے پاس کھڑے ہو کر ہم تینوں نے یہ طے کیا کہ پرکاش اور سلونیا کار سے اٹلی جائیں

یورپ گھومتے ہوئے۔ پرکاش ورونا میں سلونیا کے ماں باپ سے ملے اور ان سے سلونیا سے شادی کرنے کی اجازت لے اور میں دو ہفتہ بعد ان لوگوں سے ورونا میں ملوں اور ہم سب مل کر شادی کی تاریخ مقرر کریں۔ سلونیا نے رائے دی کہ میں ۱۱ر اگست کی شام کے چار بجے ورونا میں "کیفے دانتے" میں ملوں۔

"مگر سلونیا دانتے تو فلورنس کا رہنے والا تھا، کہیں تم مجھے فلورنس آنے کے لیے تو نہیں کہہ رہی ہو؟" میں نے سلونیا سے پوچھا۔

"ہاں دانتے تھا تو فلورنس کا ہی مگر چودھویں صدی کے سیاسی حالات نے جب اٹلی کے اس بڑے شاعر اور فلاسفر کو در بدر بھٹکنے پر مجبور کر دیا تو ہم ورونا والوں نے ہی دانتے کو آسرا دیا تھا۔ ہمارے شہزادوں نے اس کو قدر و منزلت دی تھی۔ مگر تم دانتے کو کیسے جانتے ہو؟" سلونیا نے مجھ سے پوچھا۔

"میں ٹیگور اور غالب کو جانتا ہوں، شیکسپیئر اور بائرن کو جانتا ہوں تو پھر تمہیں اور دانتے کو کیوں نہ جانوں گا؟" میں نے جواب دیتے وقت سلونیا کی آنکھوں اس کے بالوں، اس کے ہونٹوں، اس کی باہوں پر نظر دوڑائی مگر اس کے چہرے پر سے سوائے خوبصورتی کے کسی اور جذبہ کا اظہار نہ تھا۔

یورپ میں ہوائی جہاز، ریل اور بسوں کا انتظام اتنا اچھا ہے کہ دور سے دور جگہ بھی مقررہ وقت پر پہنچنے میں دشواری نہیں ہوتی۔ میں ۱۱ر اگست کی صبح آٹھ بجے ہی ورونا پہنچ گیا تھا۔ ہوٹل میں اپنے لیے کمرہ لے کر ایک نقشہ کی مدد سے میں شہر دیکھنے نکل گیا۔ خوبصورت سلونیا کا شہر مجھے واقعی بہت خوبصورت لگا۔ جگہ جگہ اونچی اونچی محرابیں تھیں جیسے حسین معشوق کے ابرو ہوتے ہیں، دریا اور نہروں پر بنے ہوئے خوبصورت پل تھے، بڑے بڑے میوزیم اور پرانے گرجے تھے۔

یہ دو ڈھائی لاکھ کی آبادی کا شہر مجھے واقعی بہت پیارا لگا۔ یہاں پر جنگیں لڑی گئی تھیں، بادشاہ قتل ہوئے تھے، حملہ آور آتے رہے تھے، سیاست بدلتی رہی تھی۔ اس شہر نے پچھلے ہزار برس میں سلطنتوں کا عروج دیکھا تھا، زوال دیکھا تھا۔ ہر گلی کے نکڑ پر یہاں تاریخ سرگوشیاں کرتی ہوئی ملتی،

ورونا کے چوڑے پلوں کے نیچے چھوٹی چھوٹی خوبصورت دوکانیں مجھے بہت اچھی لگیں وہیں چھوٹے چھوٹے کیفے تھے جہاں مرد عورتیں بیٹھ کر باتیں کرتے رہتے۔ شہر کے اکثر فٹ پاتھ کشادہ تھے تاکہ راہ گیر ایک دوسرے سے مل سکیں، کھڑے ہو کر بات کر سکیں، خوب لمبے چوڑے چوک تھے جن میں بڑی بڑی رنگین چھتریوں کے نیچے دوکان دار اپنا سامان اونچی اونچی آواز میں لگا کر بیچتے ہیں۔ ورونا میں سڑکوں پر اور گلیوں میں میں نے شرارت کرتے ہوئے ہنستے مسکراتے بچوں کو بھی دیکھا اور کندھے اچکا اچکا اور ہاتھ نچا نچا کر مسلسل باتیں کرتی ہوئی عورتوں کو بھی اور کیفوں میں شراب اور کافی پیتے ہوئے خوش پوشاک مردوں کو بھی جو خود کو دنیا کے تمام مردوں کے مقابلے میں زیادہ حسین، زیادہ عاشق مزاج اور زیادہ جذباتی سمجھتے ہیں۔ یہ نظارے لندن میں کبھی دیکھنے کو نہیں ملے۔ ورونا دیکھ کر مجھے سمجھ میں آیا کہ سلوینیا کا دل لندن میں کیوں نہیں لگتا تھا۔

ورونا میں جگہ جگہ گرجے ہیں۔ اطالوی لوگ عموماً اعتقاد پسند اور مذہبی ہوتے ہیں۔ مجھے سینٹ اناستیزیا کا گرجا سب سے خوبصورت لگا۔ یہ شہر کا سب سے پرانا گرجا ہے کوئی چھ سو برس پرانا۔ گرجے میں داخل ہونے کے لیے دو اونچے اونچے دروازے ہیں جو سنگ مرمر کے ایک بہت بڑی محراب میں جڑے ہوئے ہیں۔ اندر داخل ہوتے ہی گرجے کے بہت بڑے ہونے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اونچے اونچے بڑے

بڑے ستون گوتھک وضع کی کمانوں کو سہارا دیئے ہوئے۔ بہت اونچی چھت اور بڑی بڑی کھڑکیاں۔ ہر طرف مشہور مصوّروں کی بنائی ہوئی تصویریں ہیں جو بی بی مریم اور حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کے حالات پیش کرتی ہیں۔ میں جب اس گرجے کے اندر کھڑا ہوا تھا تو اس بڑے ہال کے ایک کونے میں ایک نوجوان جوڑے کی شادی ہو رہی تھی۔ سفید لباس میں ملبوس دلہن اور کالا سوٹ پہنے ہوئے دولہا۔ دھیمے دھیمے بجتی ہوئی موسیقی اور اچھے اچھے لباس پہنے ہوئے مہمانوں کی ایک چھوٹی سی بھیڑ۔ میں نے آگے بڑھ کر دولہا دلہن کو غور سے دیکھا وہ پرکاش اور سلونیا نہیں تھے۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ اگر ان دونوں کی شادی گرجے میں ہوئی تو پھر سینت اناستیزیا میں ہی ہونی چاہیے۔ سفید لباس میں سلونیا کتنی پیاری لگے گی، سفید جالی دار نقاب میں سے جھانکتا ہوا اس کا چہرہ اور لانبی پلکوں کے نیچے جھکتی ہوئی کالی آنکھیں۔ میں سوچنے لگا کہ اس دن میں خود پر کیسے قابو رکھ سکوں اپنی محبوبہ کو کسی دوسرے کے لیے دلہن بنے ہوئے دیکھنا کتنا بڑا ظلم ہے!

چار بجنے سے پہلے پہلے میں نے رومیو اور جولیٹ کے گھر بھی دیکھ لیے۔ چھوٹی چھوٹی لال اینٹوں کے بنے ہوئے تیرھویں صدی کے یہ پرانی وضع کے خوبصورت گھر۔ رومیو اور جولیٹ کے خاندان ورونا میں معزز اور مشہور تھے مگر ان کی آپسی دشمنی کئی پشتوں سے چلی آ رہی تھی۔ یہ دشمنی رومیو اور جولیٹ کی بے وقت اور جوان موت کے بعد ہی ختم ہو سکی۔ جولیٹ کے گھر میں داخل ہوتے ہی وہ مشہور بالکنی نظر آئی جو اس عشق کی داستان کا اہم حصہ بن چکی ہے اور جہاں اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر حسین اور نڈر رومیو ہر رات اپنی خوبصورت محبوبہ کو صرف ایک نظر دیکھ لینے کے لیے جاتا تھا۔ جولیٹ کی بالکنی کا حسن برقرار ہے

اور اس کے قریب سبز بیلیں اگی ہوئی ہیں اور پھول کھلے ہیں مگر بے چارے رومیو کے گھر کی حالت نہایت خستہ ہے۔ اتنی کہ کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں۔ میں ورونا کی ایک حسینہ کے عشق میں گرفتار رومیو کے مکان کے سامنے کھڑا سوچ رہا تھا کہ شاید اس شہر والوں نے رومیو کو ایک تیرہ برس کی لڑکی سے عشق کرنے پر کبھی معاف نہیں کیا۔ شیکسپیئر نے چار سو سال پہلے جس زمانے میں رومیو اور جولیٹ کے عشق کی یہ دردناک داستان لکھی تھی اس سے کچھ عرصہ پہلے ہی اس بے چارے کا گیارہ برس کا اکلوتا لڑکا مرگیا تھا۔ کیا کہانی لکھنے والا اپنی ذاتی زندگی کے المیہ سے اس قدر متاثر ہو سکتا ہے کہ رومیو جولیٹ جیسی داستان لکھ دے؟

میں اپنی گھڑی دیکھتا چار بجنے سے کچھ دیر پہلے اس چوک میں پہنچ گیا جس کے بیچوں بیچ اٹلی کے بہت بڑے شاعر دانتے کا مجسمہ لگا ہوا ہے۔ اس چوک کے ایک کونے میں "کیفے دانتے" ہے جہاں مجھے پرکاش اور سلونیا سے ملنا تھا۔ سلونیا سے ملنے سے پہلے ہمیشہ میرے دل کی حرکت تیز ہو جاتی ہے، رگوں میں خون تیز دوڑنے لگتا ہے میں اپنی مٹھیاں بھینچ لیتا ہوں، دانت ایک دوسرے پر اچھی طرح جما دیتا ہوں۔ کیفے دانتے پرانی وضع سے سجایا ہوا ہے۔ کیفے کے سامنے کے حصہ میں رنگین چھتریوں کے نیچے بینت کی سفید ہتھے دار کرسیاں اور نازک سفید گول میزیں رکھی رہتی ہیں۔ کیفے میں اس وقت بہت کم لوگ تھے۔ اطالوی لوگ دوپہر میں اپنے گھروں میں جاکر آرام کرتے ہیں اور شام کو پھر چہل پہل شروع ہوتی ہے اور دیر تک رتجگا رہتا ہے۔

ایک کرسی پر بیٹھ کر میں دانتے کے مجسمے کے اطراف کھڑی ہوئی پرانی عمارتوں کو دیکھتا رہا جو سرخ اینٹوں سے بنی ہیں اور جن کے دالانوں کو دیکھ

کر لکھنؤ کے امام باڑوں کی یاد آجاتی ہے۔ مجسمہ کے قریب اینٹوں کے فرش پر بے شمار کبوتروں کا ہجوم تھا۔ میں سوچنے لگا کہ ایک طرح سے اچھا ہوا کہ میں سلونیا کے ساتھ اس کا شہر دیکھنے نہیں نکلا ورنہ میں اس کے علاوہ کسی چیز کو نہ دیکھ سکتا۔ ورونا کے مصوروں معماروں اور سنگ تراشوں کے شاہکار دیکھنے کے بجائے میں صرف سلونیا کو دیکھتا رہتا۔ وہ جو دانتے کی "ڈیوائن کومیڈی" جیسی غیر معمولی نظم سے کہیں زیادہ خوبصورت ہے۔

"سینیور؟" ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔ سفید کوٹ، سفید قمیص، کالی بوٹائی اور کالی پتلون پہنے داہنے ہاتھ پر چھوٹا سا کپڑا اڈالے کینٹے کا ویٹر مجھ سے مخاطب تھا۔

"ایک کافی لے آنا پلیز" میں نے اس سے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ چار بج کر سات منٹ ہو گئے تھے۔ سلونیا نے یہیں ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ میرا دل ایک آواز سے دھڑکنے لگا تھا جیسے ایک کبوتر سینے میں پھڑپھڑا رہا تھا دانتے کے قدموں کے پاس اپنے دوستوں سے ملنے کے لیے بے چین تھا۔

"آپ لندن سے آئے ہیں نا؟" ویٹر اسی جگہ کھڑا تھا۔ اس نے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مجھ سے یہ سوال کیا تھا۔

"جی۔ جی ہاں مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" میں نے ذرا بوکھلاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"آپ کے نام یہ خط ہے" ویٹر نے اپنے سفید کوٹ کی اوپری جیب سے ایک لفافہ نکال کر مجھے پکڑا دیا۔ اس لفافہ پر میرا نام لکھا تھا۔

"آپ کے دوست جو ڈاکٹر ہیں انہوں نے کئی دن پہلے یہ خط مجھے دیا تھا

کہ ۱۱ اگست کی شام کو چار بجے آپ کو دے دوں۔ میں ابھی کافی لے کر آتا ہوں،، ویٹر یہ کہہ کر پھرتی سے میزوں اور کرسیوں کے درمیان سے گذرتا کیفے کے اندر کی طرف چلا گیا۔

لفافے پر تحریر پرکاش کی تھی۔ خط بھی پرکاش ہی کا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ سلونیا اور وہ یورپ کے مختلف ملکوں میں گھومتے ہوئے ورونا آئے مگر بعض وجوہات کی بناء پر سلونیا نے پرکاش کو اپنے ماں باپ سے نہیں ملایا۔ اب وہ دونوں سیدھے وینس جا رہے ہیں۔ وہ لوگ وینس کے باہر ایک جزیرہ پر واقع ہوٹل میں ٹھہرینگے۔ پرکاش نے ہوٹل کا نام اور پتہ لکھا تھا کہ میں دوسرے دن وہیں آکر ان دونوں سے ملوں۔ سلونیا نے لکھا تھا کہ تم میرے شہر ورونا میں خوب گھومنا، بہت اچھا اور بہت پرانا شہر ہے۔ ہو سکے تو گاردا جھیل بھی دیکھ لینا۔ اٹلی کی سب سے بڑی اور مشہور جھیل ہے اور ہمارے شہر سے اتنی قریب ہے کہ ہم لوگ اسے اپنی جاگیر سمجھتے ہیں۔ پرکاش نے اس کے آگے لکھا تھا۔ گاردا جھیل ضرور دیکھنا سلونیا کی آنکھوں سے زیادہ گہری ہے۔

میں خاموش بیٹھا کافی پیتا رہا، دانتے کے قریب بیٹھے اڑتے غٹرغوں کرتے کبوتروں کو دیکھتا رہا، شاید وہیں کہیں میرا دل بھی ہو گا چونکہ سینے میں سکون تھا، مجھے اس بات پر افسوس رہا کہ سلونیا سے اس کے شہر میں نہ مل سکا۔ پھولوں کی اپنے باغ میں بہار الگ ہوتی ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں گاردا جھیل دیکھنے نہیں جاؤں گا۔ دنیا کی کوئی جھیل میری محبوبہ کی آنکھوں سے زیادہ گہری نہیں ہو سکتی۔ مجھے اس کا یقین ہے۔

دوسرے دن میں ورونا سے بس کے ذریعہ وینس کے لیے روانہ ہو گیا۔

بس سرسبز وادیوں سے گذرتی رہی جہاں دور دور تک انگور کی بیلیں تھیں۔ بڑی بڑی ناسپاتیوں اور رس بھرے لیموؤں کے درخت تھے۔ شاد بلوط اور زیتون کے درختوں کے جھنڈ تھے اور دور دور تک پھیلی ہوئی ہریالی تھی۔ وادیوں میں سنہری دھوپ پھیلی تھی مگر جب ہماری بس وینس کے قریب سے نکل کر ایک کشتی کے ذریعہ لیڈو کے جزیرے پر پہنچی تو بارش شروع ہو گئی تھی۔ گرمی اور حبس کو دور کرتی ہوئی فرحت بخش بارش۔ اپنے ہوٹل میں پرکاش اور سلونیا میرے منتظر تھے۔

”تم بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہو،، میں نے اپنے جسم میں تیز رفتار خون کو تھوڑا بہت قابو میں کرتے ہوئے سلونیا سے کہا۔

”یہاں کس قدر گرمی اور گھٹن ہے۔ بس بارش تو تمہارے ساتھ آئی ہے،، سلونیا نے ہوٹل کی بڑی کھڑکی سے سمندر کی اوپر گرتی ہوئی بارش کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”معاف کرنا ہم لوگ تم سے ورونا سے میں نہیں مل سکے،، پرکاش نے مجھ سے کہا ”سلونیا کہاں تو اپنے شہر کی تعریف میں گانے گاتی تھی اور کہاں ورونا میں مجھے ایک دن بھی رکنے نہ دیا۔ وہاں ہم لوگ تھوڑی دیر ہی رکے کیونکہ تمہارے نام خط دینے بھی میں اکیلا ہی گیا تھا۔ سلونیا تو کار میں ہی بیٹھی رہی۔ مجھے ڈر تھا کہ تمہیں ہماری چٹھی ہی نہ ملے اور تم بغیر ملے ہی لندن لوٹ جاؤ“

”اچھا ہوا تمہیں خط مل گیا۔ ورونا والے خط پہنچانے کے بارے میں بڑے لاپرواہ ہیں۔ اگر وہ رومیو کو جولیٹ کا خط وقت پر پہنچا دیتے تو شاید ان کا انجام اتنا غمگین نہ ہوتا“ سلونیا نے مجھ سے کہا۔

"اور نہ ہی رومیو جولیٹ کو کئی صدیاں گذر جانے کے بعد لوگ یاد رکھتے"۔ میں نے جواب دیا۔ میں سلونیا اور پرکاش کو ساتھ دیکھ کر خود کو یقین دلانے کی کوشش کرتا کہ سلونیا سے محبت کا شدید جذبہ صرف میرے ذہن کی پیداوار تھا مگر جب میں اکیلا ہوتا تو اپنے جسمانی احساسات سے چھٹکارا نہ پا سکتا۔ میرے پانچوں حواس، میرے ذہن کے ساتھ ساتھ پچھلے دو ہفتہ سے سلونیا کو ایک نظر دیکھ لینے کے لیے، اس کو قریب پانے کے لیے بے قرار تھے۔

اگلے چار دن میں لیڈو کے اس چھوٹے سے ہوٹل میں رہا جہاں پرکاش اور سلونیا ٹھہرے تھے۔ لیڈو وینس سے تھوڑی دور ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جہاں ہوٹل ہیں، کیفے ہیں اور نہایت خوبصورت ساحل ہے۔ جہاں لوگ دھوپ سینکتے ہیں۔ ان چار دنوں میں ایک بار بھی پرکاش، میں یا سلونیا وینس نہیں گئے جہاں سڑکوں کے بجائے نہریں ہیں، کاروں کے بجائے کشتیاں ہیں۔ تاریخی عمارتیں ہیں مشہور گرجے ہیں ان گرجوں کی گھنٹیوں کی آواز اکثر لیڈو جزیرے میں بھی سنائی دے جاتی۔ ہمارے ہوٹل کے سامنے سے ہر دس منٹ بعد کشتی وینس جاتی تھی مگر ہم کسی کشتی میں سوار نہ ہوتے۔ صبح سے شام تک اور رات دیر گئے تک باتیں کرتے رہتے۔ روز رات کو ہم تینوں نزدیک کے ایک مخصوص کیفے میں جا کر کھانا کھاتے۔ سلونیا نے میرے لیڈو آنے سے پہلے پرکاش کو بتلایا تھا کہ اس کیفے میں مچھلی بہت اچھی پکتی ہے، شراب اچھی ملتی ہے۔ ہم نے ہر رات وہاں کی طرح طرح کی مچھلیاں کھائیں۔ طرح طرح کی شرابیں پیں، زیتون کے تیل میں بنے ہوئے طرح طرح کے سلاد کھائے۔ کیفے کا جوان مالک اکثر ہماری میز کے قریب سے گذرتا۔ چھوٹا قد، چمکتی ہوئی پیشانی، کالے سیاہ بال،

کالا سوٹ اپنے کام میں مصروف۔ ایک رات پرکاش نے اس کو بلا کر ساتھ شراب پینے کی دعوت دی ،، بھئی آپ کی اکٹوپس مچھلی تو واقعی بہت لذیذ ہوتی ہے۔ آئیے آج رات ہمارے ساتھ شراب پیجئے،، مگر اس نے بہت رکھائی سے پرکاش کا صرف شکریہ ادا کیا مگر ساتھ نہ بیٹھا۔ شراب نہ پی۔

"شاید یہ حضرات اپنے گاہکوں سے زیادہ گھل مل جانے کے قائل نہیں ہیں" میں نے شراب کا گلاس ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"اس ڈر سے کہ کہیں ہم لوگ ادھار نہ مانگ بیٹھیں،، پرکاش نے ہنستے ہوئے کہا تھا

پرکاش اور میں ہنسنے لگے تھے۔ مگر سلونیا خاموش رہی۔ شاید اسے اپنے ہم وطن کا مذاق اڑانا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ پرکاش اور سلونیا کی بحث کا کوئی حل نہیں تھا۔ ان کی بحث ایک ایسی بلی کی طرح ہو گئی تھی جو اپنی ہی دم پکڑنے کی کوشش میں گردش کرتی رہتی ہے۔ پرکاش سلونیا کے ماں باپ سے ملنے کے لیے کہتا۔ اسی لیے وہ لندن سے اٹلی آیا تھا۔ سلونیا کا کہنا تھا کہ اس کے گھر والے قدامت پسند ہیں، رومن کیتھولک ہیں اور وہ کبھی اپنی اکلوتی لڑکی کی شادی ایک غیر عیسائی کے ساتھ نہیں ہونے دیں گے۔ اس کے چاروں بھائی پرکاش کی جان کے دشمن بن جائیں گے۔

"اگر مذہب کا ہی سوال ہے تو میں رومن کیتھولک مذہب اختیار کرنے کے لیے تیار ہوں،، پرکاش نے ایک دن عاجز آکر کہا تھا۔

"مگر تم ہندوستانی ہو، میرے ماں باپ ایک ہندوستانی سے شادی کرنا بھی پسند نہیں کریں گے،، سلونیا نے خاصی سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔

"تم اپنے ماں باپ سے ملواؤ تو سہی۔ میں انہیں راضی کر لوں گا"، پرکاش نے پھر سے اصرار کیا۔ اسے اپنی اچھی شکل، اچھی تعلیم اور اچھی ملازمت پر خاصہ بھروسہ تھا۔

"ان سے ملنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا"، سلونیا نے فیصلہ سنا دیا اور کچھ کچھ ناراض سی لگنے لگی "سلونیا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ تم مجھ سے محبت ہی نہیں کرتی ہو"، پرکاش کے چہرے پر غصہ کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔

"میں اور پرکاش ایک برس سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں" سلونیا نے میری طرف مڑ کر کہا، "یوروپ کے کتنے ہوٹلوں میں ایک ہی کمرے میں رہ چکے ہیں، یہاں لیڈو میں بھی کتنے دن سے ساتھ رہ رہے ہیں۔ اگر میں پرکاش کو نہ چاہتی تو کیا یہ سب ہو سکتا تھا؟" میں نے سلونیا کو دیکھا۔ اس کی رنگت سرخ ہو گئی تھی۔ غصہ میں وہ اور حسین لگ رہی تھی۔

دوسرے دن صبح کو مجھے لندن کے لیے روانہ ہونا تھا۔ مجھے رات کو نیند نہ آئی۔ بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ پرکاش اور سلونیا نے یہ لڑائی اٹلی آکر کیوں شروع کی۔ یہ تو لندن میں بھی ہو سکتی تھی۔ میں صبح بہت جلدی سمندر کے کنارے چہل قدمی کرنے چلا گیا۔ وہ بڑی پیاری صبح تھی۔ آسمان روشنی کے سفید پھولوں سے بنا ہوا ایک بڑا گنبد لگ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ سلونیا میرے سامنے سے آ رہی تھی۔ اس نے کالا اسکرٹ اور سفید بلاؤز پہن رکھے تھے مجھے لگا کہ جیسے سورج اس کے جسم سے طلوع ہو رہا تھا اور پھر سلونیا کے جسم کا عکس وینس کی خوبصورت عمارتوں پر پڑ رہا تھا جو سمندر کی ایک چوڑی نیلی چادر کے دوسری طرف رات بھر کے خواب سے بیدار ہو رہی تھیں۔ سلونیا میرے

قریب آکر رک گئی۔ سورج نکل آیا تھا۔

"کتنی حسین صبح ہے!" سلونیا نے مجھ سے کہا۔

"ہاں مگر آج دوپہر میں لندن لوٹ جاؤں گا"۔ میں سلونیا کو چھوڑنے کے خیال سے بہت اداس تھا۔ صبح کی دھیمی دھیمی جھلملاہٹ سمندر کی لہروں پر سے پھسلتی وینس کی عمارتوں پر پھیلتی جا رہی تھی۔ "سلونیا تم پرکاش کو اپنے ماں باپ سے ملوا کیوں نہیں دیتی ہو؟"۔

"میں نے اب تک جو پرکاش کے لیے کیا ہے کیا وہ اسے یہ یقین دلانے کے لیے کافی نہیں ہے کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں" سلونیا نے اپنی خوبصورت آنکھیں میری آنکھوں میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "مگر پرکاش بھی تو تم سے بہت محبت کرتا ہے" میں نے کہا۔

"پرکاش سے کہیں زیادہ تو تم مجھ سے محبت کرتے ہو"، سلونیا کی زبان سے یہ بات سن کر میں بے اختیار چونک پڑا۔ وہ ابھی تک مجھے دیکھ رہی تھی" پرکاش مجھ سے صرف محبت کرتا ہے۔ مگر تم تو عشق کی حد تک مجھ کو چاہتے ہو، کیوں ہے نا؟"

میں نے سر جھکا لیا اور ساحل پر پڑے چھوٹے چھوٹے پتھروں کو دیکھنے لگا اور سوچنے لگا کہ ان لہروں کو جو روزان پتھروں سے گذرتی ہیں ان کی موجودگی کا علم ہے۔ مجھے خاموش دیکھ کر سلونیا نے کہا۔

"تم تو مجھ سے کبھی شادی کے لیے نہیں کہتے، تم جو سوتے جاگتے میرے بارے میں سوچتے ہو، میری خاطر اٹلی آئے ہو مجھ سے کبھی کچھ نہیں مانگتے"

میں نے دیکھا سلونیا کے چہرے پر ایک عجیب پرسکون مسکراہٹ سی اٹھی یا صبح کی دھوپ اور سمندر کی نمکین ہوا نے اس کے حسن کو اور بھی زیادہ قاتل

بنادیا تھا۔

"پرکاش میرا بہت گہرا، بہت پرانا بہت اچھا دوست ہے۔ اور سلونیا تم اس کی محبوبہ ہو۔ بس مجھے یہی دو باتیں یاد رکھنا ہیں۔ میری دعا ہے کہ اب ہم جب بھی ملیں تو تمہاری شادی پرکاش سے ہو چکی ہو یا ہو رہی ہو۔ میں تمہیں دولہن بنا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں۔ خود پر ظلم کرنے کا مجھے اتنا اختیار تو ہونا چاہیئے۔"

وینس کے ایئرپورٹ سے چلتے وقت مجھے گمان ہوا تھا کہ سلونیا کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی سی تھی۔ میں نے پرکاش اور سلونیا سے کہا تھا کہ اگلی بار ہم ورونا کے سب سے بڑے گرجے میں ملیں گے۔ وینس سے روم اور پھر روم سے لندن جاتے وقت میں یہی سب باتیں سوچتا رہا۔ مکڑی کے مہین جالے کی طرح بنے ہوئے ہم تینوں کے آپسی کے رشتے، جذبات، احساسات۔ اور ان سب الجھنوں کے بیچ میں بیٹھی نیم مردہ سی تقدیر۔ بہرحال کہاں شروع ہوا۔ کہاں ختم ہوا اور یہ کون جانتا ہے کہ یہ ختم بھی ہوا ہے یا نہیں۔ اس مکڑی میں شاید ابھی بہت جان باقی ہے وہ خاموش بیٹھی اپنے شکار کو تاک رہی ہے میں یہ سب باتیں سوچتا ہوا اپنے ہسپتال ایک ٹیکسی سے پہنچ گیا۔ ہمارا یہ ہسپتال لندن ایئرپورٹ سے قریب ہی تھا اس لیے پہنچنے میں دیر نہ لگی۔ ہسپتال پہنچتے ہی مجھے ایک تار ملا جو ورونا کی پولیس نے بھیجا تھا۔

آپ کے دوست پرکاش گپتا کار کے حادثے میں زخمی ہو گئے ہیں۔

آپ فوراً ورونا آجائیے۔

میں نے فوراً ہسپتال میں اپنی چھٹی بڑھانے کی درخواست دی، پلیسوں

کا انتظام کیا۔ اٹلی کے لیے نیا ویزا حاصل کیا اور ورونا کے لئے روانہ ہو گیا۔ یورپ کے جہاز، ٹرینیں اور بسیں مجھے بہت سست رفتار لگے۔ تار ملنے کے کوئی چھتیس گھنٹے بعد میں ورونا پہنچ سکا۔

پولیس کے افسروں سے ملا۔ انہوں نے بتلایا کہ پرکاش کار کے ذریعہ وینس سے ورونا آرہے تھے۔ کار ان کی گرل فرینڈ چلا رہی تھیں کہ شام کے وقت یہ حادثہ ہوا۔ سڑک کے کنارے ایک پہاڑی سے وہ کار ٹکرا گئی تھی۔ یہ حادثہ ورونا کے بہت قریب آکر ہوا تھا۔ جس وقت کار پہاڑی سے ٹکرائی وہ اپنی پوری رفتار سے بھاگ رہی تھی۔

"میں خود ڈاکٹر ہوں"، میں نے پولیس افسر سے کہا "آپ مجھے سب کچھ بتا سکتے ہیں۔ کیا ان دونوں کو بہت زیادہ چوٹیں آئی ہیں ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں کار کے حادثے میں زخمی ہونے والوں کا میں نے خود علاج کیا ہے"۔

"سلونیا تو موقع واردات پر ہی ہلاک ہو گئی تھیں ان کی لاش کو کار سے علیحدہ کرنے میں ڈاکٹروں کو کئی گھنٹہ لگ گئے تھے"۔ پولیس افسر کے چہرے پر انتہائی تکلیف کے آثار تھے۔ شاید وہ خود وہاں موجود تھا جب سلونیا کے جسم کو کار سے الگ کیا جا رہا تھا"۔ اور میرا دوست، وہ کیسا ہے؟" میں نے بیتابی سے پرکاش کی کیفیت پوچھی، "آپ کے دوست کا انتقال ہسپتال پہنچنے کے دو گھنٹہ بعد ہوا۔" پولیس افسر اپنی کرسی چھوڑ کر میرے قریب آکر میرا شانہ تھپتھپا رہا تھا انہوں نے مرنے سے پہلے آپ کو بلانے کی خواہش ظاہر کی تھی"۔

مجھے سکتہ سا ہو گیا تھا۔ میں اپنی کرسی میں اور دھنس گیا۔ مجھے لگا جیسے میں کوئی نہایت ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہوں۔ پرکاش اور سلونیا کیسے مر سکتے ہیں۔

ان کی تو شادی ہونے والی ہے ورونا کے ایک بہت پرانے گرجے میں۔

"آپ کچھ پیئیں گے"، پولیس افسر واپس اپنی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

"نہیں ۔ ان دونوں کی لاشیں کہاں ہیں ؟" میں نے بڑی مشکل سے پوچھا

"وہ اس وقت سینٹ اناستیزیا کے گرجے پہنچنے والی ہوں گی ۔ آپ ٹھیک وقت پر پہنچ گئے۔ ہم نے روم میں ہندوستانی سفارت خانے کو اطلاع دے دی ہے۔ آپ کے دوست کے جسم کو یہاں جلایا جا سکتا ہے ، یا دفنایا جا سکتا ہے یا آپ لوگوں کی رائے ہو تو اسے ہندوستان واپس بھیجا جا سکتا ہے مگر اس میں خرچہ بہت زیادہ ہوگا"، پولیس افسر نے مجھے سمجھایا۔

جب میں پولیس کی کار میں اس بڑے گرجے پہنچا تو دو چمکتے ہوئے لکڑی کے بنے ہوئے تابوت ان دونوں دروازوں میں سے اندر لے جائے جا رہے تھے جو سنگ مرمر کی ایک بہت اونچی محراب میں جڑے ہوئے تھے ۔ میں اور پولیس افسر اندر گئے۔ اس بڑے ہال کے ٹھیک اسی حصہ میں جہاں چند روز پہلے میں نے ایک شادی ہوتے دیکھی تھی ان دونوں تابوتوں کو ساتھ ساتھ رکھا گیا۔ عنابی رنگ کی ایک لمبی قبا پہنے ہوئے ایک پادری نے آخری رسومات ادا کرنا شروع کئے ۔ وہ لاطینی زبان میں کچھ پڑھتا رہا اور وہاں جو لوگ موجود تھے سر جھکائے سنتے رہے ۔ گرجے میں بیس پچیس مرد اور عورتیں ہوں گے ۔ سب کالا لباس پہنے تھے ۔ ان میں ایک ادھیڑ عمر کا جوڑا بھی تھا۔ وہ دونوں چپکے چپکے رو رہے تھے وہ سلونیلا کے ماں باپ ہوں گے۔ جن سے ملنے کا پرکاش کو اس قدر اشتیاق تھا۔ گرجے میں موسیقی بجنا شروع ہو گئی۔ مگر اس روز کی شادی کی اور آج کی موسیقی میں بہت فرق تھا۔ دل بے ساختہ رونے کو چاہ رہا تھا مگر میں ضبط کرتا رہا۔ میں نے قریب کھڑے ہوئے پولیس افسر سے پوچھا

کہ "سلونیا کے جسم کو جلایا جائے گا یا دفنایا جائے گا؟"

"سلونیا نے سنا ہے کوئی ایک مہینے پہلے اپنے ماں باپ کو لندن سے خط میں لکھا تھا کہ اگر وہ مر جائے تو اس کے جسم کو جلانے سے پہلے ان کے تابوت کو تھوڑی دیر کے لیے جولیٹ کے مزار کے پاس رکھا جائے" پولیس افسر نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر میرے سوال کا جواب دیا۔

"سینیور۔ کیا آپ تھوڑی دیر کے لیے گرجے سے باہر آسکتے ہیں؟" میں نے پولیس افسر کے چہرے سے نظریں ہٹا کر مڑ کر دیکھا تو کالا سوٹ اور کالی ٹائی پہنے ایک نوجوان کو خود سے مخاطب پایا۔

"چلیے" میں نے اس سے کہا اور اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ گرجے کے اندھیرے میں اپنے عزیز دوست اور اپنی حسین محبوبہ کے تابوتوں کے قریب، موت کی دردناک اور غمگین موسیقی سنتے سنتے میرا دم گھٹنے لگا تھا۔

ہم دونوں باہر آئے تو ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی آسمان پہ پھیلنے لگی تھی۔ گرجے سے دور بالکل سامنے ہی ایک چھوٹا سا چوراہا تھا جہاں ہارن بجاتی کاریں ادھر اُدھر مڑ رہی تھیں۔ وہیں چوراہے پر ایک بڑی سی نیلی بس آکر رکی تھی جس میں سے سیاح اترنا شروع ہو گئے تھے ان کے گلوں میں کیمرے لٹکے ہوئے تھے۔

"آپ کی شکل جانی پہچانی لگتی ہے" میں نے جوان سے کہا جو مجھے اپنے ساتھ گرجے سے باہر لایا تھا۔

"جی۔ وینس کے قریب لیڈو جزیرے پر میرا کیفے ہے۔ آپ کئی رات اپنے دوستوں کے ساتھ وہاں آتے رہے تھے" دوستوں کا ذکر کرتے وقت اس نے ہاتھ سے گرجے کی طرف اشارہ کیا ان تابوتوں کی طرف جن میں پرکاش اور سلونیا لیٹے

ہوئے تھے۔

"مگر آپ یہاں کیسے ۔۔۔؟" مجھے یاد آگیا کہ ہم اس کیفے میں مل چکے تھے جہاں مچھلی اچھی پکتی ہے اور جہاں اچھی شراب ملتی ہے، وہ جوان اس کیفے کا مالک تھا پر کاشی نے کہا تھا کہ وہ اپنے گاہکوں سے اس لیے دوستی نہیں کرنا چاہتا کہ کہیں ادھار نہ دینا پڑے۔

"میں ۔۔۔ میں،" وہ جوان بات کرنے میں جیسے ہکلانے لگا۔ میرا نام روبرٹو ڈو بلو ہے اور میں سلونیا کا شوہر ہوں۔"

"شوہر؟؟" میں نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ گرجے میں داخل ہوتے ہوئے سیاح مڑ کر ہمیں دیکھنے لگے۔ مجھے ایسا لگا جیسے میری آنکھوں کے سامنے مکڑی کے بڑے بڑے جالے جھول رہے ہوں۔ روبرٹو نے جواب دیا "جی ہاں" سلونیا کا شوہر!"

"مگر سلونیا نے کبھی یہ نہیں بتلایا کہ اس کی شادی ہو چکی تھی"۔ میں نے روبرٹو سے کہا۔

"جی ہماری شادی کو تو کئی برس ہو چکے ہیں، اسی گرجے میں ہماری شادی ہوئی تھی ہم دونوں ساتھ مل کر لیڈو میں وہ کیفے چلاتے تھے جہاں آپ آچکے ہیں۔ ایک دن چھوٹی سی بات پر ہمارا جھگڑا ہو گیا تھا اور وہ روٹھ کر لندن چلی گئی تھی۔ سلونیا کو مجھے تڑپانے میں بڑا مزہ آتا تھا،" روبرٹو نے کہا۔

"مگر وہاں لیڈو میں ۔۔۔ آپ کے کیفے میں ۔۔۔ کبھی یہ پتہ ہی نہ چلا کہ آپ ایک دوسرے کو جانتے بھی تھے،" میں نے اس سے سوال کیا۔

"سلونیا چاہتی تھی کہ میں اس کو دوسرے مرد کے ساتھ دیکھ کر اس سے

جھگڑا کروں۔ مگر میں نے بہت ضبط کیا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ سلونیا اور آپ کے دوست کو جان سے مار ڈالوں۔ مگر میں خاموش رہا۔ میں سلونیا کو بہت چاہتا ہوں، چاہتا تھا،، رو.برٹو اب پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

”کہیں ایسا تو نہیں کہ ان دونوں کی موت اتفاقاً نہ ہوئی ہو بلکہ تم نے جان بوجھ کر ۔۔۔،،

میری بات سن کر رو برٹو کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ اس نے میری بات کاٹ دی۔

” موت تو غیر فطری انداز میں ہی ہوئی ہے مگر میں نے انہیں نہیں مارا۔ مقدس مریمؑ کی قسم میں نے انہیں نہیں مارا۔ آپ چاہیں تو ابھی گرجے میں پادری کے سامنے قسم کھا کر آپ کو یقین دلا دوں،، اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

” تو پھر یہ کار کا حادثہ کیسے ہوا؟،، میں نے رو برٹو سے پوچھا۔

” میں سلونیا کو بچپن سے جانتا ہوں ہمارے گھر جولیٹ کے مکان کے قریب تھے۔ اسی محلہ میں۔ سلونیا ہمیشہ سے اس کہانی کو سچ مانتی آئی تھی۔ ہماری جب نئی نئی دوستی ہوئی تھی تو وہ مجھے ہمیشہ رو برٹو کے بجائے رومیو ہی پکارا کرتی۔ وہ کہتی تھی کہ عشق آدمی کرے تو ایسا کہ دنیا یاد رکھے۔ سلونیا کو ٹھیک سے کار چلانا نہ آتی تھی۔ اس کے کار چلانے پر بھی ہمارا جھگڑا ہوتا تھا،، رو برٹو اپنی جیب سے ایک اچھی طرح تہہ کیا ہوا سفید رومال نکال کر اپنی آنکھیں خشک کرنے لگا۔

میں نے محسوس کیا کہ گرجے میں موسیقی بند ہو چکی تھی۔ مڑ کر دیکھا تو دونوں تابوت ساتھ ساتھ باہر لائے جا رہے تھے۔ سڑک پر چلتے ہوئے بہت سے لوگ رک گئے تھے اور اپنے داہنے ہاتھ سے اپنے سینوں پر صلیب کے نشان بنا رہے تھے، وہ سیاح جو تھوڑی دیر پہلے اندر گئے تھے گرجے سے باہر نکل کر تابوتوں کی تصویریں لے

رہے تھے۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ ان میں سے ایک تابوت تھوڑی دیر بعد جولیٹ کی قبر کے پاس رکھا جائے گا ورنہ وہ اپنی بس میں بیٹھ کر اس کا لونٹ پہنچ جاتے جہاں روایت ہے کہ جولیٹ دفن ہے۔

دوسرا تابوت ورونا کی پولیس کی حفاظت میں رہے گا جب تک ہندوستانی سفارت خانے سے یہ پتہ نہ چل جائے کہ پرکاش کے ماں باپ اپنے جوان بیٹے کی لاش ہندوستان واپس منگوانا چاہتے ہیں یا ورونا میں دفنانا یا جلانا چاہتے ہیں۔ ورونا جو محبت کے دیوانوں کا شہر ہے۔ مجھے اس وقت تک ورونا میں رہنا ہوگا جب تک یہ تصفیہ نہیں ہو جاتا۔ میں ورونا میں رہوں گا سلونیا کے شہر میں، رومیو جولیٹ کے شہر میں جہاں پولیس کی رپورٹ کے مطابق ہر سال چند لڑکے اور لڑکیاں محبت کی اس عظیم کہانی سے متاثر ہو کر پاگل پن کی اس حد تک عشق کرتے ہیں کہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ پولیس افسر کے ساتھ اس کی چھوٹی سی کار میں بیٹھے ہوئے میں سوچنے لگا کہ سلونیا کو ہم میں سے کون سب سے زیادہ چاہتا تھا۔ پرکاش ؟ روبرٹو یا میں ؟؟؟ اور سلونیا کس کو چاہتی تھی،۔۔ خود کو ؟ یا اپنے شہر کی پرانی اور قدیم کہانیوں کو ؟؟
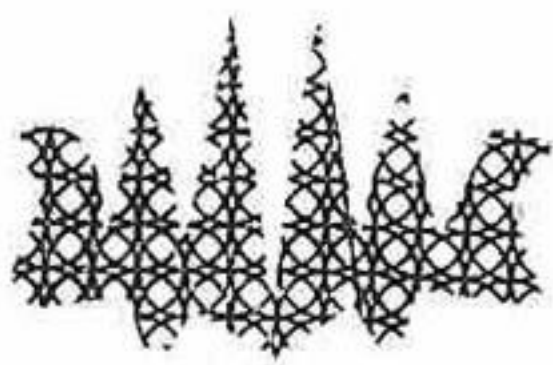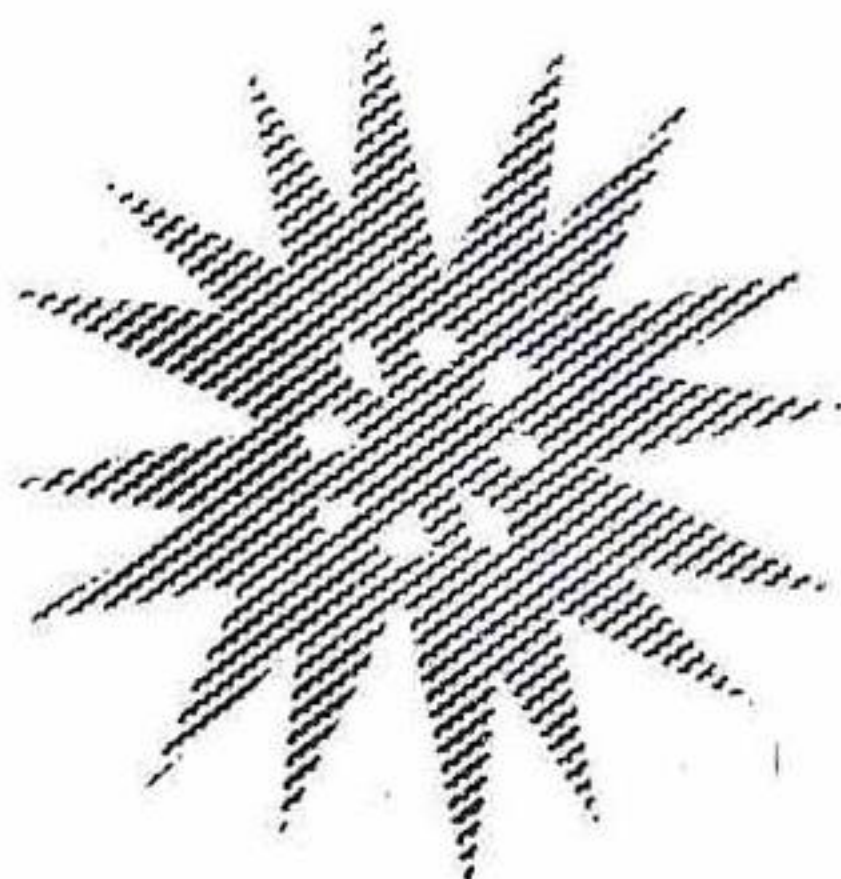
ہٹ دھرم

انگلستان میں کوئی کھانے پر بُلائے تو مہمان کوئی تحفہ ضرور لے جاتا ہے۔ عموماً لوگ پھولوں کو ترجیح دیتے ہیں، کیونکہ پھول سب ہی انگریزوں کو پسند ہیں۔ ان کے اپنے چھوٹے چھوٹے باغیچے ہوتے ہیں جہاں وہ خوش رنگ پھول اُگاتے ہیں۔

اس شام جب میں پیلے رنگ کے ڈیفوڈل کے نازک پھولوں کا گچھا لے کر کرنل ہارڈی کی کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوا تو وہاں مجھے ہر طرف ڈیفوڈل کے اَن گِنت پودے نظر آئے جو شام کی دھیمی روشنی میں عجیب بہار دکھا رہے تھے۔ اچھا ہوتا اگر میں کوئی اور پھول چُنتا مگر اب تو دیر ہو چکی تھی۔ کرنل صاحب بڑے تپاک سے ملے۔ میں نے ان کی بیوی کو پھول پیش کئے ان کا بڑا پُر وقار جوڑا تھا۔ بعض جوڑے بوڑھے ہو کر بہت خوب صورت ہو جاتے ہیں۔ جوانی میں تو خوب صورتی ایک حادثہ ہے، مگر بڑھاپے کی خوب صورتی بڑی مشکل سے حاصل ہوتی ہے۔ اس کے لئے ریاضت کرنا پڑتا ہے۔

کرنل صاحب کا ڈرائنگ روم بے شمار ہندوستانی چیزوں سے سجا ہوا

تھا، خنجر اور تلواریں تھیں، مغل اور راجپوت تصویریں تھیں، مہاتما بدھ کا خوبصورت مجسمہ تھا اور ان کے مسکراتے چہرے پر پھیلا ہوا ابدی سکون۔ ایک کونے میں لکڑی کی نازک الماری میں ہندوستان پر لکھی گئی کتابیں تھیں۔ اتنی زیادہ اتنی عمدہ ہندوستانی چیزیں تو شاید ہندوستان میں بھی میں نے کسی ایک ڈرائنگ روم میں نہیں دیکھی تھیں۔

ہم لوگ باتیں کرنے لگے۔ ان دونوں سے باتیں کرنا مجھے اچھا لگا۔ ان کا اور میرا ماضی ایک ہی تھا۔ بس فرق اتنا تھا کہ وہ حکمراں رہے تھے اور میں محکوم طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ میں ان سے کرید کرید کر ان کے تجربات کے بارے میں پوچھتا رہا اور بڑے سے ڈیل ڈول والے کرنل ہارڈی اور ان کی سفید بالوں والی خوب صورت بیوی بڑی تفصیل سے اپنے ماضی کو یاد کرتے رہے۔ دونوں کے خاندان کے افراد کئی پشتوں سے ہندوستان میں برطانوی فوج کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے تھے۔ ان دونوں کو تعلیم کے لئے ہندوستان سے انگلستان بھیجا گیا تھا مگر ان کی پہلی ملاقات سری نگر میں ہوئی تھی۔ دونوں چشمہ شاہی دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ کشمیر کے دل کش اور حسین ماحول میں ہی ان کی محبّت پروان چڑھی۔ نئی دلّی کے بڑے گرجا میں ان کی شادی ہوئی۔ شملہ میں انہوں نے ہنی مون منایا، حیدرآباد میں ان کا لڑکا پیدا ہوا ——— ڈیوڈ، جسے وہ لوگ ابھی تک "جنگی لاٹ صاحب" کے نام سے پکارتے تھے ——— میری فرمائش پر مسز ہارڈی اپنا البم لے آئیں اور میں تیس چالیس برس پہلے کے ہندوستان کو اُس وقت کے حکمرانوں کی نظر سے دیکھنے لگا۔ وہی جانے پہچانے لوگ، وہی مانوس لباس، وہی ہمارے مندر اور مسجدیں، وہی ہمارے قلعے اور محلات۔ ہندوستان کے حکمراں بدل گئے تھے مگر ملک وہی تھا، لوگ وہی تھے ——— ان تصویروں کو دیکھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ کچھ بھی تو نہیں بدلا

اور پھر بھی کتنا کچھ بدل گیا ہے۔ یہ انگریز بدل گئے ہیں میں ہندوستانی بدل گیا ہوں۔

اس دوران کمرے میں ایک تیس بتیس برس کا جوان داخل ہوا جس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی، بال لمبے لمبے تھے، مجھے اُس سے ملایا گیا۔ وہ ڈیوڈ ہارڈی تھا ـــــ ان کا بیٹا۔

"جنگی لاٹ صاحب ـــــ؟" میں نے مسکراتے ہوئے ڈیوڈ سے پوچھا۔

"اوہ! کیا پھر یہ لوگ اپنی ماضی کی کتاب کھول کر بیٹھ گئے؟" ڈیوڈ نے کسی قدر جھینپتے ہوئے کہا "معاف کیجئے گا میرے والدین شاید یہ کبھی بھول ہی نہیں سکتے کہ ہندوستان میں ان کی زندگی کتنی اچھی طرح بسر ہوئی تھی، آپ کے ملک میں رہ کر یہ لوگ بھی ہندوستانیوں کی طرح جذباتی بن گئے ہیں۔"

"کیوں جنگی لاٹ صاحب، کیا آپ کو ہندوستان یاد نہیں آتا؟" میں نے ڈیوڈ سے پوچھا۔

"میں بہت چھوٹا تھا جب ہم لوگ لندن واپس آگئے تھے۔ بچپن کی کچھ دھندلی دھندلی یادیں میرے اپنے ذہن میں بھی محفوظ تھیں اور پھر ممی اور ڈیڈی سے ہندوستان کا ذکر اتنی بار سُنا ہے کہ ایسا لگتا ہے وہاں کی شان و شوکت میں میرا اپنا حصّہ بھی تھا۔ ویسے بھی زیادہ تر انگریز صرف سنی ہوئی باتوں کی بنیاد پر ہندوستان کو اپنی میراث سمجھتے ہیں۔" ڈیوڈ کے لہجے میں ایسا محسوس ہوا جیسے اسے ان انگریزوں سے شکایت تھی جو اس قسم کے خیالات رکھتے ہیں۔

"آپ ڈیوڈ کی باتوں پر بالکل دھیان نہ دیں۔" کرنل ہارڈی نے مجھ سے کہا "آج کل کے نوجوان تو ہر بات پر اعتراض کرنے لگتے ہیں۔"

"آپ ہندوستانی جو انگلستان میں نئے نئے آئے ہیں سمجھتے ہیں کہ یہاں رہنے بسنے میں صرف آپ لوگوں کو ہی مشکل پیش آتی ہے۔" ڈیوڈ نے اپنے باپ کے جملے کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی گفتگو جاری رکھی "سچ پوچھئے تو اصل مشکل تو میرے والدین جیسے لوگوں کو پیش آتی ہے جو ہندوستان کے ٹھاٹ باٹ نہیں بھول سکتے اور بدلتے ہوئے انگلستان کے حالات سے مطابقت پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ آپ آج نہیں تو کل اپنے ملک واپس چلے جائیں گے، مگر یہ لوگ یہیں رہیں گے، اور اپنے نوکروں آیاؤں کو یاد کرتے رہیں گے۔ وہ عیش ان لوگوں کو اب کبھی میسر نہ ہوں گے۔" ڈیوڈ کے لہجے میں خاصی تلخی تھی۔ پھر وہ اپنی ماں سے مخاطب ہوا "ممی مجھے معلوم نہیں تھا کہ آج شام آپ کے پاس مہمان آئے ہوئے ہیں، مجھے تو باہر جانا ہے۔" مسز ہارڈی کے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر باہر چلا گیا۔ دیر تک ہم تینوں خاموش بیٹھے رہے ــــــ اپنے اپنے خیالوں میں گم۔

"کیا جنگی لاٹ صاحب آپ کے اکلوتے بیٹے ہیں؟" میں نے کرنل صاحب سے پوچھا۔

"ہماری ایک بیٹی بھی ہے، مریم ــــــ وہ ڈیوڈ سے تین برس چھوٹی ہے۔" مسز ہارڈی نے جواب دیا "مریم پیرس میں بہت کامیاب ماڈل ہے۔ میں ابھی اس کی تصویریں لاتی ہوں۔" وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں۔

"ڈیوڈ واقعی سچ کہتا ہے۔ ہماری زندگی کا بہترین حصہ ہندوستان میں گزرا۔" کرنل ہارڈی شاید مجھ سے کہہ رہے تھے یا شاید وہ خود سے باتیں کر رہے تھے۔ ان کی نظریں سامنے دیوار پر سجائی ہوئی دو تلواروں اور ان کے درمیان لٹکی ہوئی کالی ڈھال پر تھیں۔ "ہندوستان برطانوی تاج میں ایک بڑے سے

جگمگاتے ہیرے کی مانند تھا۔" اتنا کہہ کر قریب کی میز کی دراز سے کرنل صاحب نے سُرخ مخمل سے منڈھا ہوا ایک کیس نکالا اور اسے کھول کر مجھے ایک سونے کا کڑا دکھانے لگے۔ میں نے کڑا اپنے ہاتھ میں لیا۔ کوئی آٹھ دس تولے کا ہوگا۔ بڑے عمدہ اور نفیس نقش و نگار اس پر بنے ہوئے تھے۔ کرنل صاحب نے اس کڑے کی تاریخ مجھے بتائی تو میرا دل بھاری ہوگیا۔ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری کے بعد مغل شہزادیوں کو ہمایوں کے مقبرے میں بند کیا گیا تھا۔ یہ کڑا کرنل صاحب کے کسی عزیز نے کسی مجبور اور بے کس شہزادی کے ہاتھ سے اتارا تھا۔

اتنے میں مسز ہارڈی اپنی بیٹی مریم کی تصویریں لئے واپس کمرے میں آگئیں۔ میں نے کڑا واپس سُرخ کیس میں رکھ دیا اور مریم کی بڑی بڑی رنگین تصویریں دیکھنے لگا۔ اس کی صورت بہت پیاری تھی، بال کالے تھے اور آنکھیں جیسے خالص شہد کی دو بڑی بڑی شفاف بوندیں، سورج کی کرنوں سے جگمگاتی ہوئی ـــــ عجیب سی مٹھاس تھی ان میں۔ مریم کے قد و قامت سے غیر معمولی دبدبے کا اظہار ہوتا تھا۔ جیسے کسی بڑے ملک کی شہزادی رسمِ تاج پوشی کے لئے تیّار کھڑی ہو۔ میرے دل میں کسی نے چپکے سے کہا کہ اگر مریم لندن میں رہتی تو کتنا اچھا ہوتا پھر میں اپنے بوڑھے انگریز میزبانوں کو ڈرتے ڈرتے دیکھا کہ کہیں انھوں نے میرے دل کی آواز نہ سُن لی ہو۔

"کیا یہ سونے کا کڑا مریم کی کلائی میں اور خوب صورت نہیں لگے گا؟" میں نے کرنل ہارڈی سے کہا۔

"نہیں، قطعی نہیں،" کرنل ہارڈی نے فوراً جواب دیا "ہم پہلے ہی ایسا ایک کڑا کھو چکے ہیں ـــــ سری نگر میں ہمارے ایک نوکر نے اُسے چُرا لیا تھا" کرنل

صاحب جیسے اس واردات کی پوری تفصیل سنانے کی تمہید باندھ رہے تھے۔ ان کے چہرے پر سرخی پھیلنے لگی تھی۔

"اب جانے بھی دو اس قصّے کو"، مسز ہارڈی نے ان سے التجا کی، مگر وہ خاصے غصّے میں تھے۔

"کشمیر میں ہمارا ایک ملازم تھا ——— وحید خاں۔ اس نے ہمارا کڑا چُرا لیا تھا۔ جب ہمیں اس چوری کا پتہ چلا تو وحید خاں بھاگ گیا پولیس نے اسے ایک قریب کے گاؤں میں جا پکڑا اور اسے خوب مارا پیٹا۔ مگر وہ کڑا نہ ملا۔ مجھے آج اٹھائیس برس گزر جانے کے بعد بھی اس کڑے کے کھوئے جانے کا سخت افسوس ہے۔ آپ کے ملک میں نوکروں پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے وہ نہایت بے ایمان ہوتے ہیں ——— چور، لٹیرے ٹھگ!"

کرنل صاحب کا چہرہ اب جذبات سے بالکل سرخ ہو گیا تھا۔ میں دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ اس مظلوم مغل شہزادی نے کرنل صاحب کے اس عزیز کے بارے میں کیا سوچا ہوگا جس نے اس معصوم کے ہاتھ سے کڑے اتروائے ہوں گے۔ وہ بیچاری تو اپنے دل کا حال کسی سے کہہ بھی نہ پائی ہوگی۔

کھانا ہم تینوں نے مکمل خاموشی میں کھایا۔ میں نہایت افسردہ تھا چلتے وقت میں نے کرنل ہارڈی سے کہا کہ چور ہر ملک میں ہوتے ہیں۔ انگلستان کی جیلوں میں جو اتنے قیدی بھرے پڑے ہیں وہ فرشتے تو نہیں ہو سکتے۔ پھر میں نے مسز ہارڈی سے کہا "کاش کسی دِن آپ لوگ یہ دیانت دارانہ فیصلہ کرلیں کہ یہ کڑا ہندوستان کی حکومت کو لوٹا دینا چاہیئے، کیونکہ یہ دراصل ہندوستان ہی کی امانت ہے یا پھر کاش کسی دن میں اس قابل ہو جاؤں کہ آپ کو آٹھ دس تولے کا ایک کڑا دے سکوں

تاکہ آپ وحید خاں کی چوری کی وجہ سے ہم ہندوستانیوں کے بارے میں غلط رائے قائم نہ کریں۔ ہم جو اپنی روزی کمانے کے لئے جب آپ کی ملازمت ہندوستان میں کرتے تھے اور آج یہاں انگلستان میں پھر اپنی محنت بیچتے ہیں!"

اس رات جب میں اپنے گھر لوٹ رہا تھا تو باہر اندھیرے میں ڈیفوڈل کے پھولوں کا پیلا رنگ چھپ چکا تھا۔ اندھیرا ساری خوب صورتی کو ڈس لیتا ہے۔

دوسرے دن صبح سویرے مسز ہارڈی نے فون پر مجھ سے کہا کہ میں اسی روز ان سے ملوں۔ وہ بولیں "میرے شوہر لندن سے کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ تم ضرور آنا۔ بہت ضروری باتیں کرنا ہیں!"

سہ پہر کو میں مسز ہارڈی سے ملا۔

مجھے دیکھتے ہی انہوں نے کہا "کل رات تم جب گئے تھے تو تم بہت افسردہ تھے۔ اس لئے رات بھر مجھے بھی نیند نہیں آئی۔ میں تمہیں ایک ایسی بات سنانا چاہتی ہوں جو آج تک میں نے کسی سے نہیں کہی ــــــ ڈیوڈ اور مریم سے بھی نہیں۔ وہ دوسرا کڑا وحید خاں نے نہیں چرایا تھا، حالاں کہ اس بے چارے پر الزام یہی لگایا گیا تھا!"

"مگر یہ تو سراسر زیادتی ہوئی نا!" میں نے مسز ہارڈی سے کہا۔

"ہاں ــــــ زیادتی تو ہوئی۔ مگر کبھی کبھی ہم سب لوگ زیادتیاں کرتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ رہی ہوں کہ یہ کوئی اچھی بات ہے۔ ہوا یہ تھا کہ ڈیوڈ چھوٹا سا تھا۔ جب ہم لوگ حیدر آباد سے پھر کشمیر گئے۔ جھیل کے کنارے ہمارا مکان تھا۔ ہم انگریز افسر بس آپس میں ہی ملتے جلتے تھے۔ ہر وقت وہی پولو اور برج، جن اور ٹانگ، وہسکی اور سوڈا، ڈنر جیکٹ اور ایوننگ ڈریس ــــــ ہندوستان

میں سیاسی حالت تیزی سے بدل رہی تھی مگر ہم لوگ ایک الگ دُنیا بسائے ہوئے تھے ــــــ نقلی، مصنوعی بناوٹ بھری۔ مجھے ان باتوں سے بڑی الجھن ہوتی تھی۔ ایک عجیب سی گھٹن کا احساس چھایا رہتا تھا۔ میں روز دیر تک گھوڑے سواری کرتی، جھیل میں تیرتی، دُور دور تک ٹہلنے جاتی۔ مگر دل کو تسکین نہ ہوتی۔ ایک روز میں اپنی کوٹھی واپس لوٹنے پر گھوڑے سے اتر رہی تھی تو وحید خاں نے میری مدد کی۔ وحید خاں ہمارے گھر کئی سال سے ملازم تھا۔ بڑا لمبا، چوڑا، خوب صورت پٹھان تھا وہ ــــــ مگر اس دِن گھوڑے سے اترتے ہوئے اتنے برس میں پہلی بار میں وحید خاں کے اتنے قریب آئی تھی۔ اس کے ہاتھ طاقت ور اور مضبوط تھے اور اس کے جسم سے پسینے کی بُو آرہی تھی۔ اس صبح وہ ہمارے آتش دان کے لئے کلہاڑی سے لکڑیاں چیر رہا تھا۔ شاید زندگی میں پہلی بار میں نے ایک محنتی انسان کے پسینے کی مہک کو سونگھا تھا۔ اور پھر یہ مہک میرا پیچھا کرتی رہی ــــــ گھر کی تنہائی میں، کاک ٹیل پارٹیوں کے ہجوم میں، ہر جگہ، ہر وقت ــــــ میں آہستہ آہستہ وحید خاں کے قریب آتی گئی۔ اس کا سینہ چوڑا چکلا تھا، اس کے بال کالے اور چمک دار تھے اس کی آنکھیں شہد کے رنگ کی تھیں ــــــ" مسز ہارڈی کی آنکھیں دُھندلا سی گئی تھیں۔ ان کی آواز میں کشمیری جھیل کے کنارے کھڑے ہوئے تناور درختوں میں شام کے وقت گزرتی ہوئی ہوا کی سرگوشیاں تھیں۔

"مریم کی آنکھوں میں بھی تو شاید شہد کی مٹھاس بسی ہوئی ہے؟" میں نے مسز ہارڈی سے کہا۔ مجھے کل رات دیکھی ہوئی تصویریں یاد آگئیں مریم کے حُسن کو بھولنا آسان نہیں تھا۔

"ہاں ــــــ مریم وحید خاں کی بیٹی ہے اس کے حسن میں پٹھان اور

انگریز خون کا میل ہے دو محبّت کرنے والے دلوں کی دھڑکن کی گونج ہے۔ اسی لئے مریم ہمیشہ گھر سے دُور رہی ــــــ کرنل صاحب کو ایک دن اتّفاق سے وحید خاں کی اور میری دوستی کا پتہ چل گیا۔ وہ غصّے میں بپھرے ہوئے پستول لے کر وحید خاں کے پیچھے دوڑے۔ وحید خاں قریب کے ایک گاؤں میں چھُپ گیا۔ کرنل صاحب نے دوسرے دن پولیس کو وحید خاں کے پیچھے لگادیا، اور چوری کے الزام میں اسے پکڑوا دیا ــــــ وہ اپنی بدنامی نہیں چاہتے تھے ــــــ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ایک انگریز افسر کی بیوی اور ایک ہندوستانی نوکر کے عشق کا چرچا ہو۔"

"مگر پھر دوسرے کڑے کا کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"دوسرا کڑا کبھی تھا ہی نہیں۔ کرنل صاحب کے خاندان کے ہاتھ صرف ایک کڑا ہی آیا تھا۔"

"اور اتنے برس سے آپ لوگ اپنے دوستوں کے سامنے ہندوستانی نوکروں کو بے ایمان اور چور کہتے رہے ہیں ــــــ غالباً ڈیوڈ اور مریم بھی یہی سمجھتے ہوں گے؟"

"ہاں" مسز ہارڈی کی آواز بہت اداس سی تھی۔ "مجھے اس بات کا ہمیشہ افسوس رہا ہے، مگر کبھی ہمّت نہیں ہوئی کہ سچ بات کسی سے کہہ سکوں۔ اسی لئے آج تمہیں خاص طور سے بُلایا ہے کہ کہہ سکوں کہ ہم انگریزوں میں بھی انسانی کمزوریاں ہوتی ہیں۔ رقابت کی آگ ہمیں بھی جلاتی ہے۔ ہم بھی جان بوجھ کر کبھی کبھی جھُوٹ بولتے ہیں۔ ہار ماننے کے بجائے ہم بھی کبھی کبھی ہٹ دھرمی کر بیٹھتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جب ہم کِسی ہندوستانی سے محبّت کرتے ہیں تو اس کی کوئی انتہا نہیں ہوتی، اگرچہ کبھی کبھی مجبوریاں ہمیں اس کا کھلا اقرار کرنے سے روک دیتی ہیں۔ ہم اپنے محبوب سے بچھڑنے کے اٹھائیس برس بعد بھی اس کے پسینے کی مہک کو عزیز رکھتے ہیں۔" مسز ہارڈی کی نیلی آنکھوں میں آنسوں کانپ رہے

تھے: "کاش میں یہ سب وحید خاں سے کہہ سکتی۔"

میں اس سہ پہر جب کرنل ہارڈی کی کوٹھی سے باہر نکلا تو ڈیفوڈل کے پیلے پھول دھوپ میں آہستہ جھول رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر ہندوستان میں کبھی میں وحید خاں سے ملا بھی تو شاید یہ تو کہہ سکوں کہ لندن میں ایک انگریز خاتون، جو کبھی بہت حسین رہی ہوں گی، آج اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی انہیں یاد رکھتی ہیں، ان لمحوں کو یاد رکھتی ہیں جو کشمیر کی شاداب وادیوں میں انہوں نے ساتھ بتائے تھے۔ مگر شاید وحید خاں سے میں یہ نہ کہہ سکوں گا کہ ان کی خوب صورت بیٹی مریم پیرس میں ماڈل ہے اور نت نئے طریقوں سے اپنے جسم کی نمائش کرتی ہے ــــــــ یہ بات سُن کر بوڑھے وحید خان کو شاید بہت رنج ہوگا۔
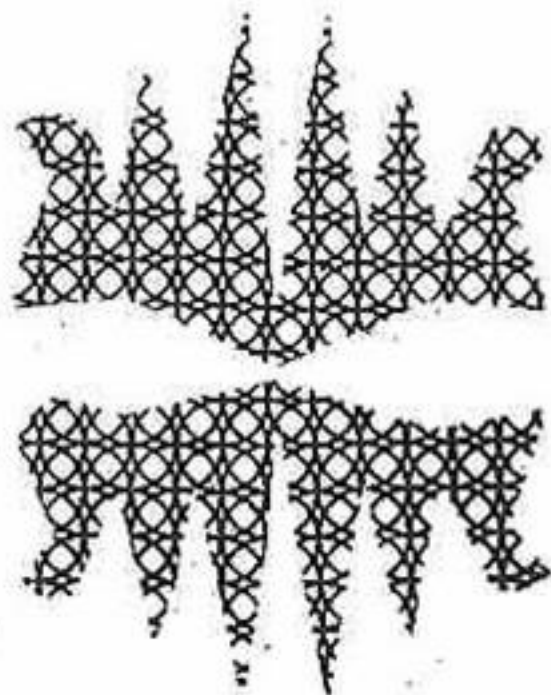
بے نام رشتے

کامران جیسے ہی لندن کے ہیتھ رو ایر پورٹ کے ٹرانسزٹ لاونج میں اپنا بیگ لیے داخل ہوا اس کی نظریں اپنے داہنے ہاتھ کی طرف دور کونے میں رکھی ہوئی چوڑی کرسی پر بیٹھی ہوئی خاتون کی طرف اٹھ کر ٹھہر گئیں۔ سرمئی رنگ کے چائنا سلک کی ساڑی پہنے ہوئے یہ کامران کی اپنی امّی جان تھیں۔ کامران اس ساڑی کو پہچانتا تھا چونکہ چند مہینے پہلے ٹینا کے ساتھ اس مخصوص رنگ کی تلاش میں اس نے ٹورنٹو کی ایک ایک دکان چھان ڈالی تھی۔ ٹورنٹو سے روانگی کے وقت کامران نے سوچا بھی نہ تھا کہ اس کی امّی جان لندن ایر پورٹ پر یوں بغیر کسی اطلاع کے مل جائیں گی۔ اور پھر پہننے کے لیے اسی ساڑی کا انتخاب کریں گی۔ یہ ساڑی کامران نے اپنی امّی جان کو ٹینا کی طرف سے دی تھی۔

"امّی جان" کامران نے کرسی کے بہت قریب جا کر اپنی امّی جان کو آہستہ سے آواز دی۔

"تم آ گئے بیٹے، مجھے پتہ تھا کہ تم سے یہیں مل سکوں گی اسی لیے کتنے گھنٹوں

سے یہیں تمہارا انتظار کر رہی ہوں ——— چلو بیٹے مجھے تم اپنی ٹینا کے پاس لے چلو، میری کلثوم کے پاس لے چلو" امی جان تھکی ہوئی تھیں پھر بھی ان کی نرم آواز میں ممتا کا ہر سُر موجود تھا۔ ان کی آنکھیں شفقت سے دھندلا سی گئی تھیں اور ایسا لگتا تھا کہ کئی دن کی جاگی ہوئی بوڑھی آنکھوں میں پتلے پتلے آنسو تیر رہے ہوں کامران اپنی امی جان کے قریب جا کر سبز قالین پر بیٹھ گیا اور اپنا سر ان کی گود میں رکھ دیا۔ وہ اس گود کی نرمی کو، اس کی خوشبو کو، اس کی گرمی کو پہچانتا تھا۔ پردیس میں ممتا سے بھری اس گود کی یاد نے اس کو ہمیشہ سہارا دیا تھا۔

صرف پانچ مہینے پہلے ہی تو وہ کینیڈا سے کانپور صرف اس خیال سے گیا تھا کہ اپنی ماں کو اس بات پر راضی کر والے کہ وہ ٹینا سے شادی کر سکے۔ ماں کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے کامران نے ہر حربہ آزمانے کی ٹھان رکھی تھی۔ ٹینا سے شادی کی آرزو کو کامران نے اپنا مقدر بنا لیا تھا۔

"امی جان آپ ٹینا کو بہت پسند کریں گی، وہ یونان کی رہنے والی ہے اور خدا نے ضرور ٹینا کو یونانی شاعروں اور بت سازوں سے مشورہ کر کے بنایا ہوگا" کامران نے اپنی امی کو کانپور میں سمجھایا تھا۔ وہ ہر ماں کی اس کمزوری سے واقف تھا کہ وہ گھر میں خوب صورت بہو لانے کے خواب دیکھتی ہے۔

"مگر بیٹے اچھی بیوی بننے کے لیے لڑکی کا صرف رنگ روپ ہی تو دیکھنا نہیں چاہیے" کامران جانتا تھا کہ اس کی امی جان قدامت پسند تھیں اور یونان کی حسینہ سے تو کیا وہ کانپور کی رہنے والی کسی غیر سید لڑکی سے بھی اپنے بیٹے کی شادی کے لیے تیار نہ ہوتیں۔

"امی کچھ عرصہ جہاں میں رہتا ہوں اور جہاں کرسٹینا اپنی بیوہ ماں

کے ساتھ رہتی ہے چھوٹا سا شہر ہے ـــــــــ ہمارے شہر کے سب مرد اور عورتیں، بچے اور بوڑھے کرسٹینا کو جانتے ہیں، اس کو پیار سے ٹینا کہہ کر بلاتے ہیں۔ ٹینا ہمیشہ ان کے دکھ درد میں شریک رہتی ہے، شادی بیاہ میں ہاتھ بٹاتی ہے، بچوں کو پکنک پر لے جاتی ہے ـــــــــ اس نے بڑی کار صرف اس لیے لے رکھی ہے کہ ایسے لوگوں کو شاپنگ کروانے یا عبادت کرانے لے جاسکے جن کا اس دنیا میں کوئی اور نہیں" اور کانپور میں اپنی ماں کو ٹینا کی یہ باتیں سناتے ہوئے کامران نے سوچا تھا کہ ٹینا کا دل ایک خوب صورت باغیچہ کی طرح تھا جہاں خوشبودار اور رنگین پھولوں سے مہکی ہوئی کیاریاں تھیں، سایہ دار سبز روشیں تھیں اور رس بھرے پھلوں سے لدے ہوئے بڑی شاخوں والے درخت تھے۔ کامران کو اپنی امی جان سے باتیں کرتے کرتے یاد آیا تھا کہ ایک روز چیسٹر میں ایک لائبریری سے کسی ضعیفہ کے لیے کتابیں لے کر جب ٹینا جلدی جلدی اپنی پارک کی ہوئی بڑی جاپانی کار کی طرف بڑھ رہی تھی تو کامران نے اس کا راستہ روک کر پوچھا تھا "ٹینا تمہیں اتنے سارے لوگوں کی خدمت کے لیے آخر کہاں سے وقت ملتا ہے، تم پورے دن نوکری کرتی ہو اور کمپیوٹر پروگرامنگ کرنا کوئی آسان کام تو نہیں، گھر کے کام کاج میں اپنی بوڑھی ماں کا ہاتھ بٹاتی ہو۔ اور طرح طرح کے مربے چٹنیاں اور شربت بناتی ہو، ضد کر کے میرے کپڑے دھوتی ہو، ان پر استری کرتی ہو، تم لڑکی ہو کہ کوئی مشین اور اگر مشین ہو تو اتنی حسین کیوں کر ہو؟"

"دیکھو کامران میں جوان ہوں اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ توانائی میری نس نس سے پھوٹنے کے لیے تیار ہے اور جوانی ہزار مشکلوں کو آسان کر دیتی

ہے اور وقت کو ربر کے ایک فیتہ کی طرح کھینچ کر لمبا کر دیتی ہے۔ مجھے انسان پسند ہیں، ان کے ساتھ وقت گذارنا پسند ہے اور دوسرے ہم عمروں کی طرح ٹورنٹو جا کر کسی تاریک ڈسکو میں بہت تنگ کپڑے پہن کر اونچی موسیقی پر پاگلوں کی طرح رقص کرنے کے بجائے مجھے کسی ہسپتال میں مریضوں کا دل بہلانا پسند ہے اور کامران تم جو میرے لیے اتنے فکرمند رہتے ہو مجھے یہہ بات بھی بہت پسند ہے" ایسی باتیں کرتے وقت ٹینا کی سیاہ آنکھیں اور زیادہ کالی دکھلائی دینے لگتیں اور چنبیلی کے پھولوں جیسی نازک رنگت پر ایک گلابی تمازت پھیل جاتی۔ وہ سنجیدہ ہو کر بہت زیادہ خوب صورت نظر آنے لگتی لیکن جب وہ کسی بات پر کھلکھلا کر ہنستی تو اس کے ہموار دانت اس طرح نظر آنے لگتے کہ کامران خود بھی بے اختیار مسکرانے لگتا۔

کامران نے ٹینا کو بچپن میں اکثر وسیع شاپنگ سنٹر میں ایک لانڈری کے قریب اکثر طرح طرح کی آئسکریم کھاتے اور لوگوں سے سنجیدگی سے باتیں کرتے دیکھا تھا اور چونکہ وہ خود بہت شرمیلا، خاموش اور ہر بات سنجیدگی سے سوچنے والا جوان تھا اس کو یہہ پھرتیلی، چست، سنجیدہ مزاج یونانی لڑکی بہت پسند آنے لگی تھی۔ کامران کو یقین ہو گیا تھا کہ اس کی اندرونی تلاش جیسے ختم ہو گئی تھی۔ کامران کا دل کہتا تھا کہ ٹینا اس کا ہاتھ پکڑ کر رنگین پھولوں سے سجے ایک ایسے راستہ پر چلنے لگے گی جہاں صرف سکون ملے گا، خوشی ملے گی، خوشبوؤں کا رقص ہوگا، روشن مستقبل ہوگا اور مستقبل کے اُس پار افق ہی افق ہونگے۔ کامران کے خیال میں ٹینا میدان میں بہتے ہوئے گہرے دریا کی طرح گمبھیر تھی۔ ایسے ہی دریا کے پانی کی طرح اس نوجوان حسینہ کی طبیعت میں ٹھہراؤ تھا۔ دور سے دیکھو تو لگتا تھا کہ پانی میں حرکت ہی نہیں ہے اور پھر بھی یہہ دریا کہیں رکتے نہیں، کھیتوں

کو سیراب کرتے ہیں اور پھر دُور کہیں سمندر میں جاکر مل جاتے ہیں، اپنی گہرائی ایک اور بڑی گہرائی میں سمو دیتے ہیں۔

"چلو میں مان لیتی ہوں" کامران کی امی جان نے کانپور میں اپنی حویلی کے اونچے چھت والے دالان میں اپنے اکلوتے بیٹے کو اس کے خیالات سے چونکاتے ہوئے کہا تھا" کہ تمہاری دوست ٹینا خوب صورت بھی ہے اور سارے شہر میں بے حد مقبول بھی ہے مگر اس کا مذہب الگ ہے اور ہمارا الگ ہے"

"امّی جان یہہ بھی تو اچھی بات ہے کہ ہمارے خاندان کی طرح ٹینا کے گھر والے بھی بہت مذہبی ہیں۔ وہ لوگ گریک اَورتھَوڈوکس چرچ کے ماننے والے ہیں۔ ہر طرح کی رسومات اور توہمات کے پابند ہیں ——— جیسے آپ سفر پر جانے والوں کو امام ضامن باندھتی ہیں اسی طرح یہاں کانپور آتے وقت ٹینا نے سینٹ کرسٹوفر کا تعویذ میرے ساتھ کر دیا ——— یہہ دیکھیے امی جان ——— سینٹ کرسٹوفر کو ہم لوگ شاید حضرت خضر کے نام سے پکارتے ہیں اور حضرت خضر ہی تو ہیں امی جان جو سب مسافروں کو ان کی منزل تک خیریت سے پہنچاتے ہیں۔" کامران نے تعویذ اپنی امّی جان کو دیا۔

"اچھا یہہ تعویذ واپس پہن لو" امی جان نے چاندی کی باریک زنجیر میں لٹکا ہوا سینٹ کرسٹوفر کا تعویذ اپنے بیٹے کو لوٹا دیا۔ انھوں نے اس تعویذ کو بہت عقیدت سے پکڑ رکھا تھا۔

"اور امی جان ——— ٹینا کے گھر والے ہماری طرح میٹھے بھی بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ ان کی شہد میں ڈوبی ہوئی میٹھی سوئیاں تو بہت ہی لذیذ ہوتی ہیں اور امی جان ٹینا کی والدہ کو گھریلو نسخوں پر حد سے زیادہ یقین ہے۔

وہ کہتی ہیں کہ بکری کا دودھ پینے سے دمّہ کی شکایت نہیں ہوتی۔" ٹینا کی والدہ کی سادہ لوحی کو یاد کر کے کامران خوش مزاجی سے ہنسنے لگا تھا اور اُٹھ کر دالان میں ٹہلنے لگا تھا۔ کامران کو یاد آیا تھا کہ کانپور میں اس نے اپنی ہونے والی ساس اور ہر وقت کالے کپڑے پہننے والی ٹینا کی گوری چٹی والدہ کے بارے میں سوچتے ہوئے دل ہی دل میں خود سے کہا تھا کہ ٹینا بھی پچاس پچپن برس کی عمر میں اپنی والدہ کی طرح خوب صورت نظر آئے گی اور کامران کو اس طرح سوچ میں ڈوبا ہوا دیکھ کر اس کی امی جان نے کہا تھا۔

"کہیں ٹینا کو دمّہ کی شکایت تو نہیں" کامران کی والدہ کو ٹینا کو بہو نہ بنانے کا ایک اور بہانہ مِل گیا تھا۔

"نہیں امّی جان ______ ٹینا بالکل صحت مند ہے اور اگر وہ اپنی ماں کے بنائے ہوئے مربّے اور پیسٹریاں کیک کھانا کم نہیں کرے گی تو شاید موٹی بھی ہو جائے گی مگر آج کل اس کا جسم بہت متناسب اور سڈول ہے" اور کامران کو یاد آیا کہ ایک شام جب ٹینا اس کے گلے سے لگی ہوئی تھی کامران نے اس کے جسم کی گدازی کی لذت کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا تھا " ٹینا کیا تم اپنے دماغ کے ساتھ ساتھ سارے جسم سے سوچتی ہو، دیکھتی ہو، پرکھتی ہو؟" اور ٹینا نے اس کے اور قریب آتے ہوئے جواب دیا تھا کہ " کامران تم کیوں ایسی بے تکی باتیں سوچتے رہتے ہو؟ تم حال سے مطمئن ہونے کے بجائے ماضی اور مستقبل کے خیال سے سوالات کی بارش کرتے ہو۔ تم اس بھاگتے ہوئے لمحے سے خوش ہو لو" اور پھر کامران کو یاد آیا تھا کہ ایک دن جب ریستوراں میں چاکلیٹ آئسکریم کھاتے کھاتے ٹینا نے اپنے ٹھنڈے ہونٹوں سے اچانک کامران کے رخسار

پر پیار کر لیا تھا تو اس نے ٹینا کو سمجھایا تھا ٹینا تم مجھے یوں سب کے سامنے پیار نہ کیا کرو۔"

"کرونگی، کرونگی، کرونگی چونکہ جب میں اس طرح پیار کرتی ہوں تو تمہارے سانولے چہرے پر سرخ رنگ پھیل جاتا ہے اور ایسے وقت تم بہت ہی پیارے لگتے ہو" ٹینا نے آئسکریم کو منہ میں گھلاتے ہوئے کہا تھا۔

"اگر کہیں کانپور میں تم نے مجھے سڑک پر، کسی ریستوران میں یا اسٹیشن پر پیار کر لیا تو ہمیں پولس پکڑ کر لے جائے گی اور کم از کم سو روپے جرمانہ ہوگا۔"

کناڈا کی کرنسی میں سو روپے کتنے ہوتے ہیں؟" ٹینا نے کامران کو پھر ایک بار پیار کرتے ہوئے پوچھا تھا۔ اس بار ٹینا کے ہونٹ کامران کے ہونٹوں کے بہت قریب پہنچ گئے تھے۔ کامران کو دودھ اور چاکلیٹ کی ملی جلی خوشبو بہت اچھی لگی۔

"یہی کوئی گیارہ بارہ ڈالر"

"تو کامران تمہارے ساتھ کانپور جانے سے پہلے میں تیرہ چودہ ہزار ڈالر بچا کر لے چلوں گی ——— پولس کو جرمانہ دینے کے لیے اور ہم دونوں کانپور میں صرف تین چار دن رہیں گے" ٹینا نے اپنے کالے بالوں کو بہت ہی معشوقیت سے جھٹکتے ہوئے مسکراتے ہوئے اعلان کیا تھا اور کامران اس کے سر کے بیچ دور تک نکلی ہوئی مانگ کو دیکھنے لگا تھا اور سوچا تھا کہ اس کی امی جان اس مانگ میں شادی کے دن صندل اور افشاں بھریں گی۔ اپنی ماں سے باتیں کرتے کرتے کامران کو ٹینا کی سنجیدہ طبیعت میں غیر متوقع شرارت کا عنصر بہت پسند تھا۔ ٹینا اچانک بہت مزیدار چٹی پٹی بات کہہ دیا کرتی تھی۔

"کامران بیٹے مجھے لگتا ہے کہ ٹینا سے شادی کرنے کا بھوت تمہارے سر پر سوار ہے ـــــ تم مجھ سے باتیں کرتے کرتے نہ جانے کہاں کھو جاتے ہو، کافی دیر تک دالان اور صحن کے چکّر لگاتے رہتے ہو، آپ ہی آپ مسکراتے رہتے ہو ـــــ کامران تم کناڈا پہنچ کر ٹینا کو دس پندرہ دن کے لیے کانپور بھیج دینا ـــــ وہ یہاں کے حالات دیکھ کر بھی تم سے شادی کے لیے ضد کرے تو پھر تم دونوں شادی کر لینا۔" امی جان نے اپنے لاڈلے کے جنون کے سامنے ہتھیار ڈال دئے تھے لیکن انھیں اب بھی ایک آس تھی کہ ایک مغربی لڑکی کانپور کی گلیوں اور تنگ سڑکوں پر چلے گی، اس پرانے شہر میں ہر طرف پھیلے ہوئے کئی سو احاطوں میں رہنے والے انسانوں کو دیکھے گی، یہاں کے مچھروں سے خود کو نچوائے گی تو محبّت خود بخود اس کے دل سے دور ہو جائے گی۔

"امی جان آپ میرے ساتھ کناڈا چلیے ـــــ بوڑھے ماں باپ کے لیے تو ویزا ملنا بالکل آسان ہے ـــــ اور امی جان وہیں کنیڈا میں آپ ہماری شادی کروا دیجیے۔" کامران نے اپنی امی جان کے گلے میں باہیں ڈال کر چھوٹے بچّوں کی طرح جھولتے ہوئے کہا تھا۔

"نہیں ـــــ میں کیناڈا ویناڈا نہیں جاؤں گی، مجھے اتنا لمبا سفر پسند نہیں۔ تمہاری شادی ہو جائے کامران تو انشاء اللہ! اگلے سال حج اور زیارات کے لیے ضرور جاؤں گی۔ وہ سفر تو فرض بھی ہے اور ثواب بھی۔ اس نیک کام کے لیے تو میں سفر کی تھکن بھی خوشی خوشی اٹھا لوں گی ـــــ ـــــ لیکن بیٹے یہ یاد رہے کہ تمہاری اور ٹینا کی شادی شیعہ مذہب کے

مطابق ہوگی، وکیل اور مولوی آئیں گے، شرعی مہر بندھے گا ــــــــ اور ٹینا کا نام بھی بدلا جائے گا۔" کامران کو محسوس ہوا کہ امی جان کی آواز میں تحکم کا رنگ بڑھ گیا تھا۔

"ٹینا کا پورا نام کرسٹینا ہے امی جان ــــــــ حضرت عیسیٰ کے نام پر کامران نے امی جان کو اس خیال سے بتلایا کہ کم از کم وہ ٹینا کا نام بدلنے کے لیے ضد نہ کریں۔

"ٹینا کا نکاح کلثوم کے نام سے ہوگا" امی کی آواز سے پتہ چل رہا تھا کہ اس سلسلے میں اب ان سے بحث کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ ان کا فیصلہ قطعی اور آخری تھا۔ کامران اس بات کے خود بھی خلاف تھا کہ ٹینا کا نام اور مذہب بدلا جائے اور نکاح کرنے کے لیے کہا جائے لیکن وہ اپنی امی جان کو ناراض بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ٹینا کی ماں نے تو کامران سے نام اور مذہب بدلنے اور چرچ میں شادی کرنے کی شرطیں نہیں رکھی تھیں یا ہو سکتا ہے کہ انھوں نے یہ باتیں اپنی بیٹی سے کہی ہوں اور ٹینا نے ان کا ذکر کامران سے نہ کیا ہو۔

کانپور سے کینیڈا لوٹنے پر جب کامران نے ٹینا کو اس کا نیا نام بتلایا تو وہ بہت خوش ہوئی "کلثوم کامران آف کچھنر" ٹینا نے کئی مرتبہ گا گا کر کامران کو سنایا۔

"ٹینا ــــــــ جون میں تمہاری چھٹیاں ہیں ــــــــ تم دس پندرہ دن کے لیے کانپور جا کر میری امی جان سے مل آؤ مگر کلثوم کامران آف کچھنر اینڈ کانپور اتنا یاد رکھو کہ ہندوستان میں گرمی بہت ہوگی، اگر سردیوں

ٹک رکنے تیار ہو تو پھر میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا" کامران نے یہہ بات ٹینا کو چھیڑنے کے لیے کہی تھی وہ جانتا تھا کہ سردیوں تک کانپور جانا ملتوی نہیں کرے گی چونکہ خود اس کی طرح وہ بھی شادی کے بندھن کے لیے آمادہ تھی اور زیادہ انتظار نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"نہیں کامران ——— اس بار میں کانپور اکیلے ہی جاؤں گی اور ان ہی گرمیوں میں، سردیوں میں تو کینیڈا میں رہنا چاہیے اور یہاں کی برفباری کا مزہ لوٹنا چاہیے۔ سرما میں تو کینیڈا کی چڑیاں گرم ممالک چلی جاتی ہیں تو کامران میں کوئی چڑیا تو نہیں ——— اور پھر یہہ بھی سوچو کہ تمہارے ساتھ اتنے دن کے لیے ہندوستان گئی تو پولس مجھ پر کتنے ہزار ڈالر کا جرمانہ کرے گی" اور یہہ بات کہتے کہتے ٹینا شرارت سے مسکرانے لگی اور لپ اسٹک سے بے نیاز ان سرخ یونانی ہونٹوں کی مسکراہٹ سے جھانکتے ہوئے ٹینا کے سفید ہموار دانت بہت خوب صورت، لگ رہے تھے۔ کامران کے دل میں کسی نے چپکے سے کہا کہ اس کو بھی ٹینا کے ساتھ کانپور جانا چاہیے اور ہندوستانی پولس کو اپنی بے باکی کا جرمانہ ادا کرنے پر مجبور کرنا چاہیے اور پھر کامران نے سوچا کہ وہ دس پندرہ دن بغیر ٹینا کے ساتھ کس طرح کینیڈا میں گذارے گا۔ ٹینا کی یاد اس کو ہر لمحہ بے چین رکھے گی لیکن کامران کو پھر سے اتنی جلدی دفتر سے چھٹی ملنا ناممکن تھا۔

کچنر سے ٹورنٹو کوئی ساٹھ ستر میل دور ہے۔ کامران اپنی کار میں ٹینا کو ٹینا کے گھر سے ایرپورٹ لے جانے کے لیے روانہ ہوا تھا۔ راستہ بھر وہ کامران کو ہدایات دیتی رہی۔ چھوٹے چھوٹے کاموں کی لمبی فہرست تھی جو ہر دو میل کے سفر کے بعد اور لمبی ہو جاتی ——— ٹینا کی غیر حاضری میں یہہ سب کام کامران کو کرنا تھے

——— کسی بوڑھے کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا تھا، کسی عورت کے اُونی کپڑے لانڈری میں دھلوانا تھے، دو چھوٹی لڑکیوں کو آئسکریم کھلانے لے جانا تھا، کسی قیدی سے ملنے جیل جانا تھا، کسی ہسپتال سے مریضوں کی کتابیں اکٹھا کر کے لائبریری لے جانا تھا اور نئی کتابیں لانا تھا۔

"اور کامران، پلیز تم میری ماں کا خیال رکھنا ——— میرے سب بہن بھائیوں کی شادیاں ہو چکی ہیں، سب مگن ہیں اپنی اپنی زندگی میں ——— ——— تم میں آخر کیا جادو ہے کامران کہ ہم دونوں ماں بیٹی کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے؟" ایئر پورٹ پر لانبے چوڑے سیکورٹی آفیسر کے سامنے کامران کو لپٹا کر پیار کرتے ہوئے ٹینا نے کہا تھا۔

"جادو اگر الفاظ میں بیان کر دیا جائے تو اس کا اثر ختم ہو جاتا ہے مگر تم کو میرے گھر والوں کا دل جیتنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔ مجھے تو تمہاری ماں کو راضی کرنے مہینوں تک انھیں ہر اتوار کو چرچ لے جانا پڑا تھا ——— اور کلثوم کامران آف کچہرا اینڈ کانپور ——— اپنا خیال رکھنا، جگہ جگہ پانی نہ پینا، تیز مرچ کے سالن نہ کھانا اور ہر روز کم از کم ایک خط ضرور لکھنا، دلّی میں میرے ایک دوست، سلطان احمد ایئر پورٹ لینے آئیں گے۔ سلطان تمھیں کانپور کی فلائٹ دلوا دیں گے۔ دلّی سے پینتالیس منٹ کی اڑان ہے" سیکورٹی کی طرف جاتے ہوئے کامران بھی ٹینا کو ہدایات دیتا رہا۔

سیکورٹی سے نکلتے نکلتے ٹینا کی کئی مسافروں سے دوستی ہو گئی تھی، کسی کے چھوٹے بچہ کو اس نے گود میں اٹھا لیا تھا، کسی ہینڈ بیگ ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔

"اچھا جلدی ملیں گے کامران۔ ان دو ہفتوں میں بھول نہ جانا اس کلثوم کامران

آف کچنز اینڈ کانپور کو" اور وہ ہنستی ہوئی کسٹم کی طرف چلی گئی تھی. ٹینا کو جاتے ہوئے دیکھ کر کامران سوچ رہا تھا کہ شادی کے بعد ٹینا اسی طرح ان کا اپنا بچّہ گود میں اٹھائے ہنستی ہوئی اِدھر اُدھر جایا کرے گی۔

ٹینا کے روانہ ہوتے ہی کامران بے حد ہوم سک ہوگیا تھا۔ کچنز لوٹنے سے پہلے وہ ٹورنٹو میں ایک سنیما گھر میں ہندوستانی فلم دیکھنے گیا پھر ایک سردارجی کی دوکان سے اس نے مزیدار سموسے کھائے اور گرم جلیبیوں کے ساتھ ایک بڑا گلاس میٹھی لسّی کا پیا. کئی گھنٹہ بعد جیسے ہی کچنز پہنچ کر کامران نے اس سڑک پر کار موڑی جس پر اس کا گھر تھا تو اس نے دیکھا کہ سڑک کے دونوں طرف لگے ہوئے اونچے اونچے درختوں کے نیچے بہت ساری کاریں کھڑی ہوئی تھیں اور شاید کار چلانے والوں کو بہت جلدی تھی چونکہ انھوں نے کاریں فٹ پاتھ پر اور فٹ پاتھ اور سڑک کے درمیان لگی ہوئی گھاس پر اور حد یہ ہے کہ پھولوں کی کیاریوں کے اُوپر روک دی گئی تھیں. کئی کاروں کے دروازے کھلے ہوئے تھے جیسے ان میں سے اترنے والے مسافروں کو بہت جلدی تھی۔ اپنے اور ہمسایہ کے گھر کے درمیانی حصّہ میں اینٹوں کے فرش پر کار روک کر جب کامران کار سے باہر نکلا تو اس کا دل بہت زوروں سے دھڑکنے لگا۔ طرح طرح کے وسوسے اس کے ذہن میں گھومنے لگے کہیں وہ جلدی میں اپنے گھر کے دروازے کھلے چھوڑ کر تو نہیں چلا گیا تھا اور اس کا سب سامان چوری ہو گیا ہے یا شاید نل بند نہیں کیے تھے اور پورا گھر پانی سے بھر گیا تھا یا شاید کسی کمرے میں آگ لگ گئی ہو گی۔

"ٹینا کہاں ہے؟" کسی جانی پہچانی آواز نے اس سے پوچھا۔

"ٹینا دس دن کے لیے ہندوستان گئی ہے، چند گھنٹے پہلے ہی میں نے اسے ٹورنٹو ایرپورٹ سے فلائٹ دلوائی ہے۔" کامران نے اونچی آواز میں کہا تاکہ اس کے گھر کے سامنے کھڑا ہوا پورا ہجوم سُن لے۔ کامران نے سوچا کہ اس کی اور ٹینا کی ہونے والی شادی کی خبر اب سب کو معلوم ہو چکی تھی۔ اب اس کا بلند آواز سے یہ اعلان کرنے میں کیا حرج تھا۔

"کیا واقعی ہندوستان کے لیے روانہ ہو گئی ہے؟" یہہ کسی لڑکی کی آواز تھی جیسے کامران کی بات کا اس کو یقین نہیں تھا اور ٹینا کا ہندوستان کامران کی ماں سے ملنے جانا کوئی بہت عجیب اور معیوب بات تھی۔

"کیا تم نے ریڈیو نہیں سنا؟" محلے میں رہنے والے ایک پادری نے آگے بڑھ کر کامران سے پوچھا۔

"نہیں ——— میں تو کار میں ہندوستانی فلموں کے گانے کیسٹ پر سنتا ہوا ٹورنٹو سے آرہا ہوں" کامران اب ان سوالوں سے جھنجھلانے لگا تھا۔

"ٹورنٹو سے جو ہوائی جہاز چند گھنٹے پہلے دِلی کے لیے اڑا تھا آئرلینڈ کے قریب اٹلانٹک سمندر میں گر گیا، اطلاع یہہ ہے کہ سارے مسافر سمندر میں ڈوب گئے" یہہ کسی مرد کی آواز تھی اور یہہ بات اس طرح کہی گئی تھی جیسے ریڈیو پر خبریں پڑھی جاتی ہیں۔

"کیا؟ ——— جہاز سمندر میں گر گیا؟" کامران کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ وہ گھر کے سامنے سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔

"ہم سب یہاں اس امید میں کھڑے تھے کہ ٹینا نے یہہ فلائٹ نہیں لی ہوگی اور وہ اور تم کہیں آئسکریم کھاتے رہ گئے ہوگے اور یہہ بدقسمت جہاز"

اس کے بغیر اڑ گیا ہوگا" یہہ ایک روتی ہوئی عورت کی آواز تھی، مجمع میں کچھ اور لوگ ہچکیاں لے کر رونے لگے۔ آنسوؤں نے اب ہر سوال کو روک لیا تھا۔

لوگ آہستہ آہستہ اپنے اپنے گھروں کو لوٹنے لگے اور کامران سیڑھیوں پر بیٹھا سوچتا رہا کہ یہہ حادثہ کیسے ہوسکتا ہے۔ تین سو سے زیادہ مسافروں کو لیے ہوئے ہوائی جہاز کس طرح سمندر میں گر سکتا ہے۔ ان میں سے زیادہ تر کو چند گھنٹے پہلے کامران نے ٹورنٹو ایرپورٹ پر ہنستے بولتے دیکھا تھا اور پھر ایر پورٹ پر اُترتے سے پہلے کامران نے ٹینا کے داہنے بازو پر امام ضامن بھی تو باندھا تھا اور گھر سے چلنے سے پہلے ٹینا کی والدہ نے سینٹ کرسٹوفر کا تعویذ بھی اس کے گلے میں ڈالا تھا۔ اتنی حفاظت کے بعد ٹینا سمندر میں ڈوب نہیں سکتی۔ ضرور یہہ خبر غلط تھی اور اسی عالم میں کامران ٹینا کے گھر پہنچا تو وہاں اس کے عزیز رشتہ داروں اور دوستوں کا ایک ہجوم تھا۔ کالا چوغہ پہنے ہوئے ایک پادری روتے ہوئے لوگوں کو دلاسہ دے رہا تھا۔ ٹینا کی والدہ کی تڑپ دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ سب کامران کو اس طرح گھور رہے تھے جیسے اس کی دردناک، جوان اور بے وقت موت کا ذمّہ دار وہ خود تھا، بم کے دھماکے سے تیس ہزار فیٹ کی بلندی پر ہوائی جہاز کے پرخچے جیسے اس نے اڑائے تھے، دہشت پسندوں کا سالار جیسے وہی تھا۔ اتنے ہجوم میں ایک آدمی بھی اس کا ہمدرد نہ تھا۔ ان دوستوں میں ایک چہرہ شناسا نہ لگا۔

دوسرے دن ٹورنٹو ایرپورٹ سے جب کامران لندن کے لیے روانہ ہو رہا تھا اس نے حادثہ میں مرنے والے مسافروں کے عزیز اور اقارب کو دیکھا، ایسے باپ تھے جن کی اولاد ختم ہو گئی تھی، ایسی اولاد تھی جن کے والدین

سمندر کی گہرائی میں کھو گئے تھے۔ مرنے والوں میں ستر معصوم بچے بھی تھے۔ ٹینا نے چلتے وقت جس پیار سے بچّے کو گود میں اٹھا رکھا تھا وہ بھی مر چکا تھا۔ اور جب کامران کا جہاز آسمان اور سمندر کی نیلاہٹ کے بیچ معلق تھا اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے سارے مسافر افسردہ اور غمگین تھے اور انجن کی گھڑگھڑاہٹ کے ساتھ ساتھ کامران کو ٹینا کی آواز سُنائی دی "بھول نہ جانا اس کلثوم کامران آف چنجر اینڈ کانپور کو" اور اس آواز کے بعد ہی اس نے ٹینا کو مسکراتے ہوئے دیکھا لپ اسٹک سے بے نیاز سرخ ہونٹوں سے جھانکتی ہوئی شریر اور پرخلوص مسکراہٹ ــــ کامران کا دل چاہا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے مگر اس نے آنسو روک لیے۔

لندن میں کامران اور اس کی امّی جان نے جب آئرلینڈ جانے کی درخواست دی تب عہدہ داروں نے نہایت عاجزی سے معذرت چاہی کہ وہ دونوں آئرلینڈ میں کورک کے مقام پر نہیں جاسکیں گے جہاں مسافروں کی لاشیں اور سامان سمندر سے نکال کر لائے جا رہے تھے۔ انھیں بتلایا گیا کہ ٹینا کے قریبی عزیز لاش کی شناخت کے لیے آپہنچے تھے۔ "مگر وہ میری ہونے والی بہو تھی" امی جان نے پولس والوں اور دوسرے افسروں سے کہا تھا۔ پولس انسپکٹر نے کامران کو ایک طرف لے جاکر سمجھایا تھا کہ اپنی ماں سے کہیے کہ ہونے والی بہو اور بہو میں بڑا فرق ہوتا ہے اور پھر قریبی رشتہ دار ہی اتنے زیادہ پہنچ گئے تھے کہ ان سب کا بھیجنا محال تھا۔ سوا تین سو مرنے والے تھے اور ڈیڑھ سو لاشیں ملی تھیں، ان کا پوسٹ مارٹم ہو رہا تھا اور پھولی ہوئی، جلی ہوئی، کٹی ہوئی، پچی ہوئی، کچلی ہوئی لاشوں میں ہونے والی اَن دیکھی بہو کی لاش کو ڈھونڈ نکالنا

آسان نہ تھا۔

"مگر کامران بیٹا کلثوم سے تو ہمارا رشتہ تھا، اسی لیے میں اور تم یہاں آئے ہیں" امی جان نے روتے ہوئے اپنی سرمئی ساڑی میں آنسو جذب کرتے ہوئے کہا تھا۔

"جی ہاں امی جان ——— کلثوم کامران آف کچز اینڈ کانپور سے تو ہمارا رشتہ تھا اور ہمیشہ رہے گا۔ صرف ٹینا کے سمندر میں غرق ہو جانے سے یہہ رشتہ نہیں ٹوٹ سکتا، یہہ رشتہ اس وقت ختم ہوگا جب میں مرونگا" اور کامران کو یاد آیا کہ ٹینا کی جلد اتنی صحت مند اور ملائم تھی کہ جس جگہ بھی وہ اسے چھو دیتا تھا وہ آواز بن جاتی تھی، باتیں کرتی تھی، کچھ ایسا سکون پہنچاتی تھی جو ایک لمبی نیند سے اٹھنے کے بعد ملتا ہے اور کامران سوچنے لگا کہ ہوائی جہاز میں بم کے دھماکے سے پرخچے اڑ جانے والے جسم کی جلد کیا بے آواز ہو جاتی ہے؟ کیا سمندر میں جسم ڈوبنے سے رشتے ختم ہو جاتے ہیں؟ اور یہہ سب سوچتے سوچتے کامران کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ اپنی امی جان کو لپٹا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔
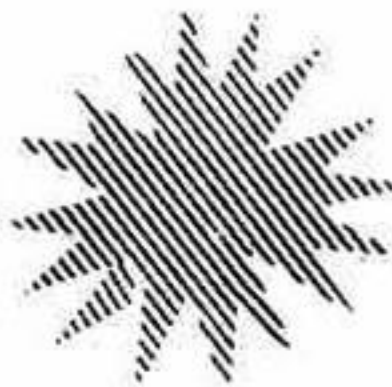
محسن

دور دور تک پھیلے ہوئے بمبئی کے گنجان شہر کی بدبودار سانسیں ہر موسم کو داغدار بنا دیتی ہیں۔ کارخانوں، ملوں، بسوں اور موٹر کاروں کے دھوئیں اونچی نیچی، پرانی نئی، عمارتوں کی دیواروں اور ان عمارتوں میں رہنے والے انسانوں کے چہروں پر مٹیالا کریم اور سیاہ پاؤڈر کا میک اُپ تھوپ دیتے ہیں۔ محسن خاں کو بمبئی سے سخت نفرت تھی، اس شہر سے جس نے کئی سال تک اسے برداشت کیا تھا اور پھر اس نعمت سے نوازا جس کے خواب محسن خاں نے دیکھے تھے۔ ایسے خوابوں کے دیئے اپنی آنکھوں میں جلائے ہر روز کئی سو لوگ بمبئی آتے ہیں اور اس شہر میں ہمیشہ کے لیے کھو جاتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں میں جو کھو گئے تھے محسن خاں کا پیارا دوست ارشاد بھی تھا۔ ارشاد کو کھوجتے ہوئے اب نہ جانے کتنے موسم بیت چکے تھے۔ محسن کو یقین تھا کہ اگر اسے بھیڑ میں بھی ارشاد کی ذرا سی جھلک بھی نظر آجائے گی تو وہ اسے پہچان لے گا، دوڑ کر لپٹا لے گا۔ دنیا میں صرف ارشاد ہی تھا جو محسن خاں کی رگ رگ سے واقف تھا، اس کا ہمراز تھا۔

محسن خاں کی بے آواز بڑی چمکتی ہوئی سرخ کار آج شام جب باندرہ کی بڑی مسجد کے سامنے ٹریفک لائٹ پر تھوڑی دیر کے لیے رکی تو محسن خاں نے اپنی کار کے تاریک شیشوں سے دیکھا کہ دو تین نو عمر لڑکیاں مراٹھی طرز کی گہرے رنگوں کی ساڑیاں پہنے ہاتھوں میں گجرے سنبھالے اُس کے لیے سڑک پار کررہی تھیں۔ وہ لڑکیاں، اور فلموں کے دیوانے بے شمار لوگ اب محسن خاں کی کار دور سے پہچان لیتے تھے۔ محسن خاں کو اپنے پرستاروں کی اتنی زیادہ توجہ بہت اچھی لگتی تھی۔ اس نے اپنے شوفر راکیش کو ہدایت دے رکھی تھی کہ وہ پھولوں کے ہار ضرور خرید لیا کرے۔ تازہ پھولوں سے زیادہ محسن خاں کو باسی پھول پسند تھے کہ ان کی پژمردہ خوشبو گذری ہوئی کل کے راز چھپائے رکھتی تھی۔

محسن خاں نے اپنی ایر کنڈیشنڈ کار سے سڑک پار کرتی ہوئی آپس میں چھیڑ چھاڑ کرتی ہوئی نو عمر لڑکیوں کو دیکھا اور ٹھیک اس وقت کار کے شیشوں پر بوندیں گرتی ہوئی دیکھیں اور محسن خاں سوچنے لگا کہ پورے بارہ مہینوں میں بمبئی میں صرف برسات کا موسم تھا جو پتوں کی ہریالی اور پھولوں کے رنگوں کو کھوئی ہوئی تازگی لوٹا دیتا تھا۔ "خوبصورتی کی ایجاد انسان نے نہیں کی اور نہ ہی دنیا کو خوبصورت بنانے کی ذمہ داری انسان پر ڈالنی چاہیے" ایک ایسے دن ارشاد نے اس سے کہا تھا جب وہ دونوں کولابہ کی کسی نئی بلڈنگ کے پورٹیکو سے سمندر پر گرتی ہوئی تیز پھوار کا گدگدانے والا منظر دیکھ رہے تھے۔ آج اپنی کار کو تیزی سے ٹریفک میں آگے بڑھتے دیکھ کر اس نے شوفر سے پوچھا۔

"تم نے آج پھول نہیں خریدے راکیش؟" محسن خاں کار میں زیادہ تر خاموش بیٹھا رہتا اپنے خیالوں میں گم اور جب بھی وہ پچھلی آرام دہ سیٹ میں

دھنسے ہوئے راکیش سے کچھ پوچھتا ان سے اپنی آواز ضرورت سے زیادہ بھاری لگتی۔

"واپسی میں لے لونگا صاب" راکیش نے ونڈ اسکرین کے اندر لگے ہوئے شیشے میں اپنے خوبصورت مالک کو دیکھتے ہوئے کہا۔ محسن خاں نے تھوڑی دیر پہلے ہی نہایت نفیس سفید کرتا اور پاجامہ پہنے تھے اور مخصوص وضع کی سفید چپلیں۔ پورے کار میں اس کی پسندیدہ خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ راکیش اب اس خوشبو کا عادی ہو گیا تھا۔

"آج تم کف پریڈ پر کانگا میم صاب کے بنگلہ پر مجھے پہنچا کر کار کی چابی دے کر چلے جانا، آج رات وہاں بہت بڑی پارٹی ہے، شاید بہت دیر ہو جائے مجھے" محسن خاں نے کہا۔

"جی اچھا صاب، کل صبح سات بجے آپ کی خدمت میں پہنچ جاؤنگا صاب"

راکیش نے پھر شیشہ میں اپنے مالک کو دیکھا۔ اسے محسن خاں کی یہ بات بے حد پسند تھی کہ وہ راکیش کو بے وجہ تھکاتا نہیں تھا، اسے نوکر نہیں انسان سمجھتا تھا۔ بارہ سال سے وہ محسن خاں کی خدمت کر رہا تھا اور اسے ایک بار بھی شکایت کا موقع نہیں ملا تھا۔ راکیش رام پور سے بمبئی ہیرو بننے کے ارادے سے آیا تھا اور برسوں دھکے کھاتا رہا اور اب فلم انڈسٹری کے اتنے مشہور ہیرو، اتنے کامیاب اداکار کا شوفر تھا۔ محسن خاں کی کار چلانے میں اس کو بہت مزہ آتا تھا۔ وہ فلم انڈسٹری کی ہر اس ہستی سے واقف تھا جن کی ذرا سی بھی اہمیت تھی۔ راکیش اداکاروں، ہیروئنوں، کہانی کاروں، مکالمہ نگاروں، ڈائریکٹروں پروڈیوسروں، شاعروں سب ہی کو جانتا تھا، ان کی گاڑیوں کو پہچانتا تھا، ان کے بنگلوں سے واقف تھا اور اس کو فلم انڈسٹری کی ہر خبر، ہر محبت، ہر شادی، ہر طلاق ہر جھگڑے، ہر ملاپ کے بارے میں سب سے پہلے خبر ہو جاتی تھی اور وہ شوٹنگ

یا ڈبنگ پر آتے جاتے محسن خاں کو تازہ ترین گپ شپ سناتا رہتا تھا۔

"دھرم جی کو ایک اور بیٹی ہوئی ہے کل رات صاب" راکیش نے ایک صبح اسے اطلاع دی۔

"راکیش! ہماری طرف ہیما جی کو گلابوں کا ایک بہت بڑا گلدستہ بھجوا دینا" محسن نے اس سے کہا۔

"حسن کمال صاب کا نیا گانا بہت ہٹ ہو گیا ہے، صاب۔"

"ایک بہت مہنگا فاونٹین پن ہماری مبارک باد کے ساتھ کمال صاب کو خود لے جا کر دینا۔"

"خاں صاب کے گردے میں بہت درد ہے، شوٹنگ کینسل کروا رکھی ہے آج کل،" ایک رات راکیش نے اپنے مالک سے کہا تھا۔

"آپریشن ہوگا کیا ان کا راکیش؟" محسن نے پوچھا۔

"نہیں صاب، سنا ہے وہ آپریشن سے بہت گھبراتے ہیں، روز صبح کچے کریلے پسوا کر کھاتے ہیں" کریلوں کی کڑواہٹ سوچ کر راکیش کو جھرجھری آگئی۔

"کل صبح فون لگا دینا ——— میں ان کی مزاج پرسی کرونگا۔ میں ان کی بے حد عزت کرتا ہوں، راکیش۔"

"جانتا ہوں صاب، ان کی عزت کون نہیں کرتا صاب مگر حکومت انھیں کبھی کوئی خطاب نہیں دیتی، ایسا کیوں ہے صاب؟"

"پتہ نہیں" محسن خاں نے کبھی یہہ بات خود نہیں سوچی تھی۔ اسے یاد آیا کہ کوئی بیس برس پہلے جب وہ ناگپور سے بمبئی فلموں میں کام کرنے آیا تھا ان دنوں صرف خاں صاحب ہی اس کا آئیڈیل تھے، وہ گھنٹوں اسٹوڈیوز کے باہر ان کی

ایک جھلک دیکھنے کے لیے کھڑا رہتا اور وہ ہلکے نیلے رنگ کی بڑی شورلے میں سفید قمیض اور سفید پتلون پہنے شرمائے ہوئے سے بیٹھے رہتے۔ محسن خاں ان دنوں ناگپاڑہ کی ایک پرانی چار منزلہ بلڈنگ فردوس محل کے ایک تاریک پتلے کمرے میں ایک اور نوجوان ارشاد کے ساتھ انتہائی مفلسی کی حالت میں رہتا تھا۔ اکثر فاقے بھی کرنا پڑتے تھے مگر ارشاد کا ساتھ تھا کہ پہاڑ جیسے دن کٹ جاتے تھے ارشاد حیدر آباد کا رہنے والا تھا، دبلا پتلا، بڑی بڑی آنکھیں، ذہانت سے چمکتی ہوئی اور حساس چہرہ، زبان میں اردو شاعری کے تمام پیچ و خم ______ ارشاد خواب دیکھتا تھا، خواب بُنتا تھا، خواب بانٹتا تھا، خواب سمیٹتا تھا، یہ وہ دن تھے جب محسن خاں محسن خاں نہیں تھا صرف دلاور تھا نہ والا تھا اور ناگپور میں اس کی ماں کی موت کے ساتھ اس کا پورا ماضی ختم ہو گیا تھا اور وہ تقدیر آزمانے کے لیے بمبئی آگیا تھا۔ بہت بھاگ دوڑ کے بعد دلاور کو اسٹنٹ رول ملنے لگے تھے، کسی سے مکہ بازی۔ لڑائی میں فرنیچر توڑنا۔ اوپر سے کودنا۔ ان فلموں میں (جو وہ اور ارشاد دیکھنے جاتے اور سب سے سستی کلاس میں پردے کے بالکل قریب بیٹھتے) دلاور خود کو بھی نہ پہچان سکتا۔

"پہلوان دلاور" کسی ایسے ہی فلم کو دیکھ کر بھنڈی بازار سے ناگپاڑہ پیدل لوٹتے ہوئے ارشاد نے اس سے کہا تھا" فلموں میں کام کرنا ہے تو زبان ٹھیک سے بولنا سیکھو ______ کیا کبھی کوئی ایسا اداکار بھی مشہور ہوا ہے جس کو ڈائیلاگ بولنا نہ آتے ہوں" اور دلاور تھانہ والا ارشاد کا یہ مشورہ سن کر خاموش تھا مگر جب اپنے کمرے میں پہنچ کر ارشاد نے بتی جلائی تھی تو دلاور نے اُس کو فرش سے اٹھا لیا تھا اور بالکنی میں لے کر آگیا تھا جہاں سے نیچے سڑک

پر لگے ہوئے قمقمے اور دوڑتی پھرتی کاروں کی روشنیاں نظر آرہی تھیں اور دلاور نے بڑی لجاجت سے کہا تھا۔

"بھیا ارشاد ——— تم سکھا دو مجھے یہہ زبان اور یہہ مشاعرہ بازی" اور ارشاد کو شاید ڈر ہوا تھا کہ وہ دلاور کے ہاتھوں سے پھسل کر چوتھی منزل سے نیچے گر جائے گا اور اس نے کہا تھا۔

"ارے پہلوان ——— یہہ کیا کر رہے ہو؟ ——— نیچے اتار دو مجھے اور شاعری کا مزہ لینا ہے استاد تو محنت کرو، عشق کرو، پروانہ کی طرح شمع کے دیوانے ہو جاؤ، چھوڑ دو یہہ کسرت اور اکھاڑے، یہہ دھینگا مستی۔"

محسن خاں کو آج اپنی آرام دہ کار میں بیٹھے ہوئے، جو بارش کی تیز پھوار میں بھیگتی ہوئی آگے بھاگ رہی تھی، ناگپاڑہ میں گذارے وہ گمنامی اور غریبی کے تاریک دن یاد آگئے جب وہ نہا دھو کر بنیان اور انڈر ویر پہن کر پتلی سی بالکنی میں کھڑا ہوتا تو اس کو اپنی خوبصورتی کا احساس بڑھ جاتا، اس کے ہاتھ چوڑے اور طاقتور تھے، اس کے بازوؤں کی مچھلیاں بڑی بڑی اور جاندار تھیں، اس کی جلد اپنی ماں کی جلد کی طرح چکنی، بے داغ، گوری اور صحت مند تھی۔ فلمی زندگی کے ابتدائی دنوں کی بے شمار مشکلوں کے باوجود آج تک اس کے چہرے پر وقت نے کوئی ایسی تحریر نہ چھوڑی تھی کہ پڑھنے والا جان سکتا کہ محسن خاں کبھی دلاور تھانہ والا تھا فلموں میں اسٹنٹ کرنے والا ایک پہلوان۔ آج اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی مگر آنکھوں کے نیچے، ہونٹوں کے کونوں کے قریب جھریاں نہ تھیں۔ اس کی آنکھیں اب بھی شفاف اور چوکس لگتیں۔ شاید اس کو اب کوئی نہیں پہچان سکتا تھا سوائے ارشاد کے مگر ارشاد نہ جانے کس خواب کے تعاقب

میں کہیں دور چلا گیا تھا۔ شاید اس کو اب اتنی مہلت نہیں ملتی ہو گی کہ وہ ناگپاڑہ کے اس زمانہ کو یاد کرے جب وہ دونوں ہر طرح کی مصیبتوں میں گھرے رہتے تھے اور پھر رات کو نیچے ایرانی ہوٹل میں بیٹھ کر پاؤ روٹی اور تیز مرچوں والا قیمہ کھاتے اور اپنے کمرے میں کسی انجانی، اَن دیکھی خوشی کی کھوج میں باتیں کرتے کرتے سو جاتے تھے۔ محسن خاں سوچ رہا تھا کہ اگر آج اسے ارشاد کہیں سے مل جائے تو وہ حیدرآبادی لہجے میں ارشاد سے کہے گا "نواب اصلی عیش ہے گذری ہوئی زندگی کو اطمینان سے یاد کرنا ——— کم از کم غالبؔ نے تو یہی کہا تھا" اور ارشاد زور سے قہقہہ لگا کر کہے گا کہ "پہلوان غالبؔ تمھیں کس اکھاڑے میں مل گئے ——— اور اصلی عیش ہے معشوق کے ساتھ گذارے ہوئے وقت کو فرصت سے یاد کرنا ——— کم از کم مجھ سے غالبؔ نے یہی کہا ہے" اور آج محسن خاں کی آنکھیں اس قہقہے کی گونج سن کر نم ہو گئی تھیں جو ارشاد نے نہیں لگایا تھا۔ محسن خاں کو محسوس ہوا جیسے وہ ارشاد سے کہہ رہا ہے کہ دوست اب میں دلاور نہیں ہوں، فلموں میں اسٹنٹ رول نہیں کرتا ہوں، دیوانہ وار موٹر سائکل نہیں چلاتا ہوں، اونچی بلڈنگ سے چھلانگ نہیں لگاتا ہوں بلکہ یہہ سب کام میرے قد و قامت کا ایک گمنام اور مجبور ایکٹر کرتا ہے اور میں اس وقت آرام کرسی پر بیٹھا میٹھی لسی پیتا ہوں اور ارشاد تمھاری رائے پر عمل کر کے میں نے خود کو اچھا بنانے کے لیے بہت محنت کی ہے اب میں غالبؔ اور اقبالؔ، اوسکر وائلڈ اور سلمان رشدی کے بارے میں دیر تک باتیں کر سکتا ہوں اور اب میں اپنے ڈائیلاگ خود لکھ سکتا ہوں اور انھیں بہت سمجھ کر بولتا ہوں ——— دیکھو ارشاد اِس میرین ڈرائیو پر میرے چہرے سے

سجے ہوئے کتنے سارے ہورڈنگ لگے ہوئے ہیں ورنہ برسات کے موسم میں مانسون کے جھکڑوں کے ڈر سے ہورڈنگ تو کیا پوسٹر تک اتار لیے جاتے ہیں مگر ارشاد کیا تم نے کبھی مجھے کسی فلم نہیں دیکھا، کیا تم نے مجھے نہیں پہچانا ——— تم جس شہر میں بھی رہتے ہو وہاں بھی بجلی کے کھمبوں پر چپکے ہوئے میرے کسی نہ کسی فلم کے پوسٹر تو ہوں گے۔ تم مجھ سے کیوں نہیں ملتے ارشاد، اس دولت اور شہرت کی ریل پیل میں میرا دل چاہتا ہے میرے دوست کہ کہیں کسی کونے میں دبک کر بیٹھ جاؤں، ایک تھکے ہوئے جانور کی طرح، صرف اپنی کھال کی گرمی میں سکون تلاش کرتا رہوں، اتنی کامیابی کے دور میں یہ کڑواہٹ کا مزہ کیوں میرے احساس پر چھایا رہتا ہے؟ کبھی یہ بادل برستا کیوں نہیں ارشاد؟ صرف تم ان سوالوں کا جواب دے سکتے ہو، صرف تم!!

کف پریڈ پر محسن خاں کی کار کو رُکے ہوئے دیر ہو چکی تھی، بارش بند تھی اور راکیش شش و پنج میں تھا کہ کس طرح اپنے مالک کو اس کی گہری سوچ سے نکالے۔ محسن خاں کو اس نے نہ جانے کتنی بار اپنے خیالوں میں گم کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے دیکھا تھا۔ نہ کتنی بار ایسا بھی ہوا تھا کہ محسن خاں کسی کے گھر پہنچ کر باہر ہی سے لوٹ جاتا، جیسے اندر جا کر مہمانوں سے ملنے کی ان میں سکت باقی نہ رہ گئی تھی مگر کانگا میم صاب کی پارٹیوں میں محسن خاں بہت شوق سے جاتے تھے۔ راکیش پہلے جا کر کانگا میم صاحب کو اطلاع دے دیتا کہ صاب آگئے تھے اور صاحب بنگلہ میں داخل ہوتے ہی دائیں طرف کے کمرے میں چلے جاتے جہاں کانگا میم صاحب ان کا انتظار کر رہی ہوتیں دو ایک

دوستوں کے ساتھ۔ راکیش کو پتہ تھا کہ پارٹیوں میں صاحب کو زیادہ بھیڑ بھاڑ پسند نہ تھی۔

"صاب" راکیش نے آہستہ سے اپنے مالک کو مخاطب کیا "ہم لوگ کف پریڈ آگئے، اب کیا حکم ہے صاب؟"

"پارٹی کے لیے تو ابھی جلدی ہی آگئے۔ ایسی جگہوں پر ہمارا تھوڑا دیر سے ہی جانا ٹھیک رہتا ہے راکیش، چلو آج مالا بار ہلز چلتے ہیں، اندھیرا ہوگیا ہے شاید تھوڑی دیر کے لیے میں اکیلے ہینگنگ گارڈن میں گھوم سکوں، اس اونچائی سے بمبئی کی تازہ بارش سے دھلی ہوئی روشنیاں دیکھ سکوں"

"بہت اچھا صاب" محسن خاں کی سرخ کار پھر سے سڑکوں پر تیرنے لگی اور اسے چلاتے ہوئے راکیش سوچنے لگا کہ اب اس کے صاب کا ایسی جگہوں پر جانا مشکل ہوگیا ہے جہاں بھیڑ بھاڑ ہوتی ہے۔ لوگ انھیں گھیر لیتے ہیں، لڑکیاں اور عورتیں تو ان پر جان چھڑکتی ہیں، نہ جانے کتنی صبح سے شام تک جوہو پر اس بنگلہ کے سامنے آکر کھڑی رہتی ہیں جس میں صاب رہتے ہیں۔

اور میرین ڈرائیو پر سے گذرتے ہوئے بائیں طرف ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر سے بے نیاز محسن خاں پھر اپنے خیالوں میں ڈوب چکا تھا۔ ڈوبنے کے لیے سمندر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ قیاس لگا رہا تھا کہ جب ارشاد کو پتہ چلے گا کہ دلاور تھانہ والا اب بہت دل پھینک مشہور ہوگیا ہے تو اس کو کیسا لگے گا۔ ارشاد ہی نے تو اس کو مشورہ دیا تھا کہ اس کو بہت سی لڑکیوں اور عورتوں سے دوستی رکھنی چاہیئے تاکہ شخصیت کے سب روپ نکھر جائیں ــــــ

— کسی کی خاطر وہ شاعری میں دلچسپی لے گا تو کوئی اس کو طرح طرح کے کھانوں کی لذت سے آشنا کرے گی، کسی کو مصوری کا شوق ہو گا تو کسی کو موسیقی کا ——— یہہ سچ ہے ارشاد کہ ان سب سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے مگر میں بدنام بھی تو ہو گیا ہوں لیکن اس بدنامی میں مجھے کتنا فائدہ ہے صرف وہی عورتیں قریب آتی ہیں جنھیں خود پر بہت بھروسہ ہوتا ہے یا پھر وہ جو اس کشتی کی طرح ہوتی ہیں جو اپنے کھلے ہوئے بادبانوں کے سہارے پانی پر تیرتی کسی منزل کی کھوج میں بھٹکنے تیار رہتی ہیں۔ مگر سچ پوچھو تو ارشاد ان سب سے مل کر، دوستی کر کے بھی اندر کی ایک پکار بے چین کیے رہتی ہے، یہہ سب دوستیاں ہلکی پھلکی رہتی ہیں، میں ہر نئی دوستی یہہ سوچ کر شروع کرتا ہوں کہ یہہ دوستی محبت اور عشق میں بدل جائے گی، پاگل پن اور عبادت بن جائے گی، ایک ایسی آگ بن جائے گی جس کی پوجا کی جاتی ہے مگر ہر دوستی الجھن بننے لگتی ہے اور پھر میں اپنی ان دوستوں سے چھپنے لگتا ہوں اور ان کے ساتھ اداکاری کرنے لگتا ہوں کہ انھیں میرے دل کا حال پتہ نہ چلے۔ شاید میری آنکھیں میرے دل کی اصلی کیفیت انھیں بتلا دیتی ہیں۔ تم نے ہی تو کہا تھا ارشاد کہ میں اداکاری صرف اپنی آنکھوں سے کرنا سیکھوں۔ میرے اچھے استاد شاید اب اداکاری اور اصلی جذبات کے اظہار میں کوئی فرق نہیں رہ گیا ہے۔

راکیش نے بالا بار ہلز کی تنگ چڑھائی کی جانب دوڑتی ہوئی سڑکوں پر سے کار کو احتیاط سے گھمایا اور اس نے ایک باغیچہ کے قریب کار روک دی۔ کبھی کبھی رات گئے محسن خاں یہاں سے شہر کا نظارہ کرنے کے لیے آتے تھے۔

محسن خاں نے چوپاٹی سے پرے سمندر کے کنارے کھڑی ہوئی اونچی اونچی بلڈنگوں اوران کے سامنے چوڑی سڑک پر لگی ہوئی آنکھ مچولی کرتی ہوئی روشنیوں کو دیکھا اور پھراس نے کف پریڈ کی طرف نگاہ دوڑائی جہاں نوشابہ کا نگا رہتی تھی، نوشابہ جس نے آج رات پھر محسن خاں کو اپنے گھر مخصوص دوستوں کی پارٹی میں بلایا تھا۔ اگر گمنام زندگی میں اس کا سب سے اچھا دوست، سب سے اچھا محسن ارشاد تھا تو کامیاب زندگی کی سب سے اچھی سوغات نوشابہ تھی لیکن نوشابہ سے دوستی بے تکلف کہاں تھی۔ محسن خاں نے کبھی اس کو یہہ بھی نہ بتلایا تھاکہ وہ خود بھی نوشابہ کی طرح پارسی تھا اور یہہ کہ اس کا اصلی نام دلاور تھانہ والا تھا اور یہہ کہ نوشابہ کے گھر جب وہ پارسی مزہ کے کھانے کھاتا تھا خصوصاً دھنساگ تو اس کو ناگپور میں اپنا گھر یاد آجاتا تھا اور اپنی گوری چٹی بھرے بھرے جسم کی ماں جو اپنے سفید ہوتے ہوئے بالوں میں بائیں طرف مانگ نکالتی تھیں اورانھیں اسکول کی چھوٹی لڑکیاں کی طرح کندھے سے اوپر کٹواتی تھیں۔ محسن خاں کو نوشابہ پہلی ملاقات میں ہی بے حد پسند آئی تھی۔ "ایک مصروف انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ پہلی نظر میں، پہلی ملاقات میں اپنی پسند یا ناپسند کا اندازہ لگالے" ارشاد نے دلاور کو برسوں پہلے مشورہ دیا تھا اور محسن خاں نے اس فن میں خاصہ تجربہ حاصل کرلیا تھا۔ ایک بڑے پروڈیوسر نے اپنے گھر ڈنر پر نوشابہ سے محسن خاں کا تعارف کروایا تھا اور محسن خاں کو نوشابہ اچھی لگی تھی ـــــ اس کی ستواں ناک کی نوک تھوڑی سی اوپر کو اٹھی ہوئی تھی جس سے وہ کسی شہزادی کی طرح مغرور لگتی تھی اور ناک کے

نیچے دو سرخ خوبصورت ہونٹ تھے جو گہری لپ اسٹک لگنے کے باوجود اچھے لگتے تھے اور نوشابہ کی جلد کی سفیدی ہر وقت دودھ کی طرح رہتی تھی جس کا رنگ نہ غصہ سے بدل سکتا تھا اور نہ شرم سے۔ نوشابہ کی آواز میں دوسروں کی توجہ کو اپنی طرف کھینچنے والے اتار چڑھاؤ نہیں تھے، ٹھہرے ہوئے پانیوں کا سکون تھا اور وہی فرحت بخش خنکی۔ اس رات نوشابہ سے مل کر محسن خاں کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ اس کی زندگی کا سونا پن دور کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے اور اس ہی رات محسن خاں پروڈیوسر کے ڈائننگ ہال کے ایک کونے میں کھڑے ہوئے بہت دیر تک نوشابہ سے آہستہ آہستہ باتیں کرتا رہا تھا۔

"نوشابہ، تم کسی دن میرے بنگلے پر آؤ، جوہو پر ——— ہم ٹھنڈی بیئر پئیں گے اور سمندر میں نہا کر گرم ریت پر پیٹ کے بل لیٹ کر باتیں کرینگے اور میں تمہارے سفید جسم پر سمندر کے پانی میں گھلے ہوئے نمک کے ذرات کو چمکتا ہوا دیکھوں گا۔"

"محسن خاں صاحب، اتنے خوبصورت طریقے سے آج تک مجھے کسی نے اپنے گھر نہیں بلایا مگر ...." نوشابہ نے اپنا جملہ پورا نہ کیا تھا اور محسن خاں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک 'ہ بھری تھی۔

"تم نے یہہ ٹھنڈی سانس لی ہے تو مجھے لگا ہے نوشابہ کہ تم نے مجھ سے بہت ساری باتیں کہہ دی ہیں" محسن خاں کو اب خوبصورت الفاظ چننے میں اور انھیں اور زیادہ خوبصورتی سے ادا کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوتی تھی۔

"میں نے کچھ بھی تو نہیں کہا ہے، یہ بھی نہیں کہا ہے کہ میں شادی شدہ ہوں، زُوبین کانگا سے شادی ہوئے آٹھ سال ہو چکے ہیں۔"

"نوشابہ ـــــــ پلیز تم اپنے شوہر کا ذکر نہ کرو اور اپنا نرم ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو تاکہ میں تمھاری گول کلائی پر اپنی انگلیاں رکھ دوں اور اپنی انگلیوں کے نیچے تمھاری دھڑکتی ہوئی نبض سے تمھارے دل کا حال جان لوں۔"

"میں آپ سے دوستی کروں گی" نوشابہ نے اپنا ٹھنڈا سا، چھوٹا سا، نرم سا ہاتھ محسن خاں کے مضبوط ہاتھ میں دے دیا تھا، "مگر ایک شرط پر" اور اس نے محسن خاں کی آنکھوں کو پورے خلوص سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

مجھے منظور ہے وہ شرط، ہر شرط "محسن خاں کی انگلیاں نبض کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

"شرط یہی ہے کہ آپ مجھے صرف ایک دوست سمجھیں گے، محبت اور عشق نہیں کریں گے، میرے دل میں جو اپنے شوہر کے لیے جگہ ہے اس کو کبھی خالی کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔"

محسن خاں کو یاد آیا کہ اس رات گھر لوٹنے سے پہلے اس نے اپنے میزبان سے زُوبین کانگا کے بارے میں پوچھا تھا اور انھوں نے کہا تھا کہ نوشابہ کا شوہر کینسر کا مریض تھا اور بہت کم اپنے گھر سے باہر آتا جاتا تھا۔

محسن خاں کو چوپاٹی اور میرین ڈرائیو کی روشنیوں اور ان کے داہنی طرف پھیلے ہوئے سیاہ سمندر کو دیکھتے ہوئے بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ کار کی طرف لوٹ گیا۔

"چلو راکیش، اب چلیں کانگا میم صاحب کے گھر۔"

"صاب" جب کار پھر سے چلنے لگی تو اس کے پرانے شوفر نے پوچھا "صاب آج آپ کچھ پریشان دکھلائی دیتے ہیں، سب ٹھیک تو ہے نا، صاب"

"ہاں، راکیش سب ٹھیک ہے ـــــــ آج بہت ساری گذری ہوئی باتیں ایک ساتھ یاد آگئیں ـــــــ تم کار اتنی اچھی طرح چلاتے ہو کہ مجھے سوچنے میں بہت آسانی رہتی ہے ـــــــ تم کار کو آگے کی طرف بھگاتے ہو اور میرا ذہن گذرے ہوئے زمانے کی طرف دوڑنے لگتا ہے۔"

"جیسے فلموں میں فلیش بیک ہوتا ہے، صاب" راکیش نے پوچھا۔

"ہاں، بس یونہی سمجھ لو ـــــــ مگر میری یادوں میں کوئی تسلسل نہیں ہوتا، محسن خاں نے جواب دیا اور سوچنے لگا کہ کوئی بھی کیمرہ مین اس کی یادوں کو فلم پر دکھانے کی کوشش کرے گا تو بس پاگل ہی ہو جائے گا اور پھر یادوں میں خوشبوئیں بھی ہوتی ہیں، اچھے کھانوں کی لذت بھی ہوتی ہے، لمس کی نرمی اور گرمی بھی ہوتی ہے، دل کے دھڑکنے کی آواز بھی ہوتی ہے ـــــــ اور یادیں صرف اپنے لیے ہوتی ہیں اور فلم ہزاروں، اور لاکھوں دیکھنے کے لیے ہوتا ہے اور یادوں کو پردہ میں چھپا کر رکھا جا سکتا ہے مثلاً ارشاد جیسے دوست کی یاد ـــــــ اپنی موجودہ کامیاب زندگی اور اس کے شور شرابے میں ارشاد کی یاد ایک گناہ بن گئی تھی اور آج رات وہ اس گناہ کے سائے سے نکل کر نوشابہ کے سجے سجائے ڈرائنگ روم میں جا رہا تھا۔ نوشابہ سے ملتا تو ایک اچھے ساتھی کی تلاش میں اس کی آنکھیں چمکنے لگتیں تھیں، تنہائی کا احساس لوٹ

آتا تھا" پہلوان، تم اپنی محبوبہ کو تلاش کرتے نہ گھومنا ـــــــ ایک دن وہ اچانک تمھارے سامنے ہوگی اور تمھارا دل ایک زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑانے لگے گا، تم چاہتے ہوئے بھی اس کے چہرے سے نظریں نہ ہٹا سکوگے" ارشاد کی آواز پھر سے اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ بعض آوازیں برسوں گذر جانے کے بعد بھی اپنا خلوص برقرار رکھتی ہیں، ان آوازوں کا لہجہ دوستی کا ہوتا ہے۔

"تم نے آج بہت دیر لگادی محسن" نوشابہ اس سے ملنے اپنے گھر کے باہر ہی آگئی تھی اور نوشابہ کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتے وقت محسن خاں سوچ رہا تھا کہ وہ نوشابہ کی آواز بھی کئی سال بعد سنتا رہے گا۔

"کیوں، آج کیا کوئی خاص بات تھی جو میرا اتنا انتظار تھا تمھیں" محسن خاں نے پوچھا۔

"تم جانتے ہو کہ تمھارے پرستاروں کو میں اپنے گھر کی پارٹیوں سے دور ہی رکھتی ہوں مگر آج میری ایک بہت پرانی سہیلی ردما، تم سے ملنے کے لیے بے چین ہے" نوشابہ نے محسن کو اطلاع دی اور وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے بنگلہ میں داخل ہونے کے بعد دائیں طرف کے کمرے میں چلے گئے، وہاں صرف ایک خاتون ان کی منتظر تھیں۔

"محسن ان سے ملو، میری بہت پرانی سہیلی ردما ـــــــ یہ کلکتہ میں رہتی ہیں، کل اچانک ایک دوکان میں شاپنگ کرتے ہوئے مل گئیں ـــــــ اور ردما محسن کا تعارف کرانے کی تو مجھے ضرورت نہیں ہے"

"نہیں نوشابہ ـــــــ میں آپ کے فلم بڑے شوق سے دیکھتی

ہوں اور فلمی میگزین میں ان کے بارے میں اتنا پڑھا ہے کہ لگتا ہے ان کو بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں اور میرے شوہر........"

"روما تم محسن سے باتیں کرو اور میں دوسرے کمرے میں مہمانوں کی خاطر مدارات کر کے ابھی آتی ہوں، تمھارے شوہر کا گلاس بھی خالی ہو گیا ہو گا" نوشابہ نے روما سے کہا اور ایک اچھی میزبان کی طرح اپنا فرض ادا کرنے دوسرے بڑے کمرے میں چلی گئی۔

محسن خاں خود کو روما کے ساتھ کمرے میں تنہا پا کر خاموش ہو گیا۔ اس کو لگا کہ اس کے سینے میں دل ایک زخمی کبوتر کی طرح تڑپنے کی تیاری کر چکا تھا، محسن خاں کے دل کی دھڑکن تیز ہو چلی تھی۔ اس نے شروع میں جھینپتے جھینپتے اور پھر بے باکی سے روما کو دیکھا اور اس کو محسوس ہوا کہ روما کو خود اپنی خوبصورتی پر ناز ہو گا، اس کو اچھی گفتگو پسند آتی ہو گی، وہ کلکتہ میں اپنے گھر میں مزیدار کھانے پکاتے ہو گی اور یہ لذیذ کھانے اپنے دوستوں کو کھلا کر خوش ہوتی ہو گی۔ محسن خاں کو روما پہلی نظر میں ہی بہت اچھی لگی اور اس نے سوچ لیا کہ اب وہ جب بھی کلکتہ جایا کرے گا اس حسینہ سے ضرور ملا کریگا۔ روما فلمی دنیا کے اس مشہور اداکار کو یوں ٹکٹکی باندھے اپنی طرف دیکھتے ہوئے نروس سی ہو گئی تھی اور سرخی اس کے ملیح چہرے پر یوں پھیلنے لگی تھی جس طرح بہار کے موسم میں شاخوں کو سبز کونپلیں لپک کر لپٹا لیتی ہیں۔ روما کا قد زیادہ لمبا نہ تھا مگر جسم بھرا بھرا سا لگتا تھا، ذرا تندرست سا۔ روما کا چہرہ گول تھا مگر اس کی گردن بہت نمایاں تھی اور ایک پیارے سے بانکپن سے تنی ہوئی تھی اور

محسن خاں کو ردما کی خوبصورت گردن سے نظریں ہٹانا مشکل ہوگیا چونکہ اس نے اپنے گھنے کالے بالوں کو ایک بڑا سا جوڑا گردن کی پشت پر نہایت آہستہ سے ٹکا رکھا تھا جو گردن ہلنے سے دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں جھول کر واپس اپنی جگہ آجاتا تھا۔ ردما کی آنکھیں بڑی بڑی اور بے حد کالی تھیں، لانبی پلکوں کے سائے میں چمکتی ہوئی۔ محسن خاں کو ان آنکھوں میں ایک دعوت سی نظر آئی۔ وہ آنکھیں ماحول کی ہر چیز کو پرکھ رہی تھیں، محسن خاں کی ہر حرکت کو تول رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ ردما کو اپنی نظروں کی زبان کے جادو کا اندازہ تھا۔ محسن خاں کو اپنی شخصیت کے سحر سے زیادہ اپنی قسمت پر پورا بھروسہ تھا اور آج اسے لگا کہ جیسے قسمت اس پر مہربان تھی۔ آج جیسے ارشاد کی پیشین گوئی پوری ہونے والی تھی۔ جیسے آج اس کی وہ محبوبہ جس کا اسے برسوں سے انتظار تھا اس کے سامنے اس کمرے میں آکر بیٹھی تھی۔ محسن خاں کے دل میں کھلبلی سی تھی۔ اس نے تصفیہ کر لیا کہ آج وہ اپنی خودداری کو بھول جائے گا اور اپنا دل آج اس حسینہ کے قدموں میں رکھ دے گا۔ ردما اس کا راستہ بھی بنے گی اور منزل بھی۔ وہ اس کی قاتل بھی ہوگی اور مقتول بھی، وہ دلبر بھی بنے گی اور دلدار بھی اور پھر محسن خاں کو محسوس ہوا کہ آج پہلی بار وہ ارشاد کے سنائے ہوئے شاعرانہ الفاظ میں اپنی زندگی کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس کو جاگتی آنکھوں سے دکھائی دینے والے یہ خواب بہت رنگین لگے۔ اس کو اپنے چاروں طرف قوس قزح کے جھولے نظر آرہے تھے۔ وہ ردما کا دل جیتنے کی پوری کوشش کرے گا۔ آج جیسے سکون کی تلاش کا سفر ختم ہو چکا تھا۔

آج جیسے اس نے قسمت کے افق کے پار جھانک لیا تھا۔

"روما، آپ نے یہہ تو کہا کہ آپ نے میری فلمیں دیکھی ہیں مگر یہہ نہیں بتلایا کہ وہ آپ کو پسند بھی آئی ہیں یا نہیں، کچھ تو تعریف کیجئے، مجھے تعریف سننا اچھا لگتا ہے" محسن خاں اپنے پرستاروں سے اس قسم کی باتیں کرنے کا سلیقہ رکھتا تھا۔ اس کو پتہ تھا کہ ہندوستانی فلموں میں تعریف کے قابل کچھ نہ کچھ ڈھونڈ لینا بہت آسان تھا چونکہ اُن میں ہر دیکھنے والے کے مذاق کے مطابق مرچ مصالحہ ہوتا تھا ——— لکھنؤ کی اردو تو بنارس کا پان والا، مغربی راز کا ایرپورٹ تو سنسکرت میں اشلوک پڑھتا ہوا برہمن، شلوار قمیض میں بھانگڑہ کرتی ہوئی لڑکیاں تو مندروں میں میراجی کے بھجن گاتی ہوئی دیو داسیاں، دیہاتی لہجہ میں بات کرنے والا رکشہ والا تو انگریزی بولتا ہوا گرمی میں اوور کوٹ پہنے ویلن اور پھر مدراسی یا پارسی لہجہ میں ہندوستانی بولتا ہوا مسخرہ۔

"دلاور پہلوان" ایک دن چرچ گیٹ اسٹیشن میں ٹکٹ کی لائن میں کھڑے ہوئے ارشاد نے مڑ کر اس سے کہا تھا" کہ ان فائٹنگ اور اسٹنٹ رولز کے لیے تو تم کوئی نام بھی رکھ سکتے ہو ——— دلاور تھانہ والا بھی چلے گا ——— مگر استاد اگر ہیرو بننا چاہو تو نام بدلنا ہوگا ——— ان فلم والوں نے سوائے سہراب مودی کے پارسی کریکٹر کے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے۔"

"تم ہی میرا کوئی اچھا سا نام رکھدو ——— میرے شاعر، پلیز" دلاور نے بہت اونچی آواز سے کہا تھا اور ارشاد نے اس کے کندھے پر اپنا

داہنا ہاتھ اس طرح رکھ دیا تھا جس طرح برطانیہ کا بادشاہ کسی بڑی شخصیت کو نائٹ ہڈ دیتے وقت تلوار رکھ دیا کرتے تھے " توسن لو پہلوان ـــــــ آج سے ما بدولت فلموں میں ہی نہیں فلموں کے باہر بھی تمہارا نام محسن خاں رکھتے ہیں" ارشاد نے اپنی ملائم آواز کو مصنوعی طور پر گرجدار بناتے ہوئے دلاور سے کہا تھا اور وہ دونوں زور سے ہنس پڑے تھے اور چرچ گیٹ اسٹیشن میں اپنے اور ارشاد کے بلند قہقہے کی گونج یاد کر کے محسن خان مسکرانے لگا اور یہ بالکل بھول گیا کہ صرف چند لمحے پہلے اس نے روما سے درخواست کی تھی کہ وہ اس کی تعریف کرے اور روما نے تعریفی الفاظ سوچ کر محسن خاں سے نظریں ملا رکھی تھیں۔

"بہت کم ہیرو آپ کی طرح ڈائیلاگ بول پاتے ہیں، سمجھ سمجھ کر ـــــــ نہایت خلوص اور سنجیدگی کے ساتھ" روما نے محسن خاں سے کہا۔

"اچھا ہوا آپ نے میرے گانوں کی تعریف نہیں کی" محسن خاں نے خوش دلی سے مذاق کے لہجے میں کہا "چونکہ پردے پر میں تو صرف ہونٹ ہلاتا ہوں لیکن گانے کشور کمار گاتے ہیں۔"

"یہ میں جانتی ہوں اور آپ کی اداکاری کے ساتھ ساتھ مجھے کشور کمار جی کی آواز بھی پسند ہے" روما نے سادگی سے اپنی صفائی پیش کی۔

"پردے پر روما میں وہی کرتا ہوں جو تماشہ بین دیکھنا چاہتے ہیں مگر پرائیویٹ زندگی میں میرا دل چاہتا ہے کہ کچھ اپنی مرضی سے کروں ـــ ـــــ ڈائریکٹروں، پروڈیوسروں، تماشہ بینوں اور اخباروں نے مجھے

قید کر رکھا ہے ـــــــــــ روما کیا آپ مجھے اس قید سے نجات دلوائینگی"
محسن خاں بے حد سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"میں بھلا آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟" روما اس قسم کے سوال سے بوکھلا گئی تھی۔

" آپ مجھے اجازت دی سکتی ہیں کہ آپ سے ملتا رہوں، آپ کے قریب رہنا مجھے اچھا لگ رہا ہے، اس جیل خانہ سے نکلنے میں آپ مدد کر سکتی ہیں، میرا ہاتھ تھام سکتی ہیں۔"

"محسن خاں صاحب، آپ اتنے مشہور اداکار ہیں، اگر یہہ قید خانے کی بات سچ بھی ہے تو آپ کے اطراف آپ کا ہاتھ پکڑ کر سہارا دینے والوں کی بھی کمی نہیں" روما اب صوفہ سے اُٹھ چکی تھی اور اپنی سفید ریشمی ساڑی کے چوڑے سرخ بارڈر کو احتیاط سے ٹھیک کرنے لگی تھی۔

"مشہور ہو جانے کے بعد اداکاروں کو صرف یہہ فکر باقی رہ جاتی ہے کہ اپنی شہرت قائم رکھنے کے لیے انھیں کیا کرنا چاہیے ـــــــــــ دوستی، خلوص، محبت یہہ صرف ایسے جذبات بن کر رہ جاتے ہیں جن کی عکاسی انھیں پردے پر کرنا ضروری ہوتا ہے" محسن خاں کی آواز سے اندازہ ہو سکتا تھا کہ جو کچھ اس نے کہا تھا وہ حرف بہ حرف سچ تھا۔

"مگر میں ـــــــــــ میں تو شادی شدہ ہوں" روما پہلی ملاقات میں محسن خاں کی اس والہانہ محبت سے پریشان تھی۔ وہ محسن خاں سے باتیں کرتے کرتے اس بڑے کمرے میں داخل ہو گئی جہاں دوسرے بہت سے مہمان تھے، مانگ

میں سندور لگائیں عورتیں تھیں، مشرق اور مغرب کے ہر فیشن سے آراستہ الھڑ لڑکیاں تھیں اور اونچی اونچی آوازوں میں باتیں کرتے مرد تھے اور ان سب کی دیکھ بھال کرتے نوشابہ اور زُوبین کانگا تھے۔

"تو کیا آپ مجھے اس بات کی سزا دینا چاہتی ہیں روما کہ آپ کی شادی سے پہلے میں آپ کو نہیں جانتا تھا ——— آپ کے شوہر کہاں ہیں؟ میں ان ہی سے بات کرتا ہوں" محسن خاں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ بہت سے مہمانوں نے ان دونوں کو دیکھ لیا تھا مگر چاہتے تھے کہ بے نیاز دکھائی دیں۔ یہ بظاہر لاپرواہ لوگ اپنے چھوٹے بیٹے یا چھوٹی بیٹی کے لیے کاغذ پر محسن خاں کے آٹو گراف لینا نہیں بھولتے تھے۔

"نوشابہ اس وقت میرے شوہر سے باتیں کر رہی ہے" روما کی نظریں اس کونے کی طرف اٹھ گئیں جہاں وہ دونوں کھڑے تھے۔ اُن دونوں نے روما اور محسن خاں کو نہیں دیکھا تھا۔ محسن خاں نے مڑ کر روما کے شوہر پر نظر دوڑائی ——— ان کے سر پر بال نہیں تھے، موٹاپے نے قد کے چھوٹے پن کو اور نمایاں کر دیا تھا، انھوں نے موٹے کالے فریم کی سیاہ عینک لگا رکھی تھی۔ اگر روما کا شوہر محسن خاں کی طرح اونچے قد، گھنے گھنگھریالے بالوں اور سرخ وسفید رنگت کا آدمی ہوتا تب بھی دونوں کا مقابلہ مشکل تھا چونکہ محسن خاں کامیاب، مشہور اور دولت مند تھا۔ روما کے شوہر کو دیکھ لینے کے بعد محسن خاں کچھ زیادہ نڈر بن گیا تھا۔

"روما ——— میں جو اتنے فلموں میں کام کرتا ہوں، ہزاروں اور

لاکھوں دکھی دلوں پر اپنی آواز کا، اپنے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا، اپنی اداکاری کا مرہم رکھتا ہوں، کیا مجھے اتنا حق نہیں کہ میں آپ کے سامنے اپنے سکون کے لیے دامن پھیلا سکوں" محسن خاں نے یہہ باتیں بہت دبی آواز میں کہی تھیں۔ اگر وہ چاہتا تو اپنی آواز اس طرح بلند کر سکتا تھا کہ پارٹی کے سب لوگ ایک ایک لفظ سن لیتے۔

"آپ بے حد عجیب ہیں ـــــــ ایک بیاہتا عورت سے پہلی ملاقات میں ایسی باتیں کر رہے ہیں" روما کی آواز ایک گھبرائی ہوئی ڈری ہوئی عورت کی آواز تھی۔

"آپ کو اگر یہہ اعتراض ہے کہ میں ایسی باتیں پہلی ملاقات میں کیوں کر رہا ہوں تو چلیے میں ہر دوسرے تیسرے روز کلکتہ آجایا کروں گا اور جب ایک ہزار ایک بار آپ کے دروازے پر دستک دے چکوں تب آپ میری محبت کا جواب اپنی محبت سے دے دیجیے گا ـــــــ کیوں یہہ شرط منظور ہے نا؟"

"اچھا اب میں چلتی ہوں، اس کمرے میں آپ کے نہ جانے کتنے دوست، کتنے پرستار ہیں، اُن سے ملیے" محسن خاں سے دور جانے کے لیے روما نے نظریں اٹھا کر محسن خاں کو قریب سے دیکھا۔

"نہیں آپ کہیں مت جائیے، میرے سامنے کھڑی رہیئے، میرے قریب تاکہ میں آپ سے باتیں کر سکوں، آپ کو دیکھ سکوں" محسن خاں کی آواز میں التجا تھی۔

"نہیں مجھے جانا ہی چاہیئے" روما یہہ کہتے ہوئے محسن خاں سے دور ہٹنے لگی، آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہوئے کمرے کے بیچ تک چلی گئی مگر اچانک کچھ سوچ کر پلٹی اور محسن خاں کی طرف آنے لگی، محسن خاں کا دل پھر زور سے دھڑکنے لگا اور پھر ایک زخمی کبوتر کی طرح پھڑپھڑانے لگا۔

"آپ سے ایک ضروری سوال پوچھنا چاہتی ہوں" روما نے اس کے قریب آکر کہا۔

"شوق سے پوچھیے، میں آپ کے ہر سوال کا جواب دونگا" محسن خاں کے ذہن میں دور کہیں شہنائی کی آواز گونجنے لگی تھی۔ روما کو وہ اپنی پوری کہانی سنادے گا۔ ناگپور کی باتیں، ناگپاڑہ کے قصے اور کامیابی کے چرچے، اس کو روما جیسے دوست کی تلاش تھی، آج اس کی محبوبہ مل گئی تھی

"محسن خاں صاحب کیا آپ دلاور تھانہ والا کو جانتے ہیں؟" روما نے اس سے سوال کیا۔

"جی؟؟؟ ——— کون تھانہ والا؟؟" محسن خاں کا سر ایکدم چکرانے لگا۔ روما کے سادہ سے سوال کا جواب دینے میں اس کو حد سے زیادہ مشکل آپڑی تھی" یہہ دلاور تھانہ والا کون ہیں؟ کیا فلموں میں کام کرتے ہیں؟"

"جی ہاں فلموں میں کام کرتے ہیں ——— میرے شوہر کے بہت پرانے دوست ہیں۔ ارشاد اور دلاور یہیں بمبئی میں ناگپاڑہ میں ایک کمرہ میں ساتھ رہتے تھے، کئی برس پہلے کی بات ہے ہماری شادی سے پہلے کی" روما نے کہا

"آپ اپنے شوہر سے کیوں نہیں پوچھتیں کہ ان کے دوست دلاور کہاں ہیں؟" محسن خاں کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔

"ارشاد کہتے ہیں فلم انڈسٹری بہت بڑی ہے، لوگ یہاں کھو جاتے ہیں اور وہ جو زیادہ شہرت پاتے ہیں بہت زیادہ خود غرض ہو جاتے ہیں ـــــــ آئیے میں آپ کو ارشاد سے ملا دوں" روما نے محسن خاں سے نہایت پر خلوص لہجہ میں کہا۔

"میں ان سے پھر کبھی ملوں گا" محسن خاں نے پھر اس کونے کی طرف نگاہ دوڑائی جہاں نوشابہ ارشاد سے باتیں کر رہی تھی "نوشابہ سے کہہ دیجئے گا کہ مجھے آج رات کھنڈالا جانا ہے، کل صبح پو پھٹے شوٹنگ ہے" محسن خاں نے کچھ اس طرح کہا جیسے کیمرہ مین اس کا کلوز اَپ لینے کے لیے تیار تھا اور محسن خاں کو اپنی آنکھوں کی پتلیوں کی ذرا سی حرکت سے بھی باخبر رہنا تھا۔ ذرا سی بے توجہی سے اس کا سارا راز کیمرہ کی فلم میں ریکارڈ ہو جاتا۔ اس نے نوشابہ کا لگا کے بنگلہ سے نکلتے ہوئے اپنے سفید کرتے کی جیب سے کار کی چابیاں نکالیں مگر پھر کچھ سوچ کر قریب سے گذرتی ہوئی ٹیکسی کو آواز دے کر روکا۔

"کہاں لے چلوں صاحب" ٹیکسی والے نے محسن کو پہچان لیا تھا اور اپنی قسمت پر ناز کر رہا تھا کہ اتنا بڑا ایکٹر اس کی ٹیکسی میں آکر بیٹھ گیا تھا۔

"ناگپاڑہ لے چلو میرے بھائی ـــــــ فردوس محل کے نیچے ایرانی ہوٹل میں کھانا کھائیں گے۔ بہت بھوک لگی ہے" محسن خاں نے کہا اور

ٹیکسی والا سوچنے لگا کہ محسن خاں فلم دیوداس میں دلیپ کمار کے آخری ڈائیلاگ کی بہت اچھی کاپی کر رہا تھا ——— وہی جب بیل گاڑی میں دیوداس مرنے سے پہلے پارو کے گھر جاتا ہے ——— اپنا وعدہ نبھانے۔
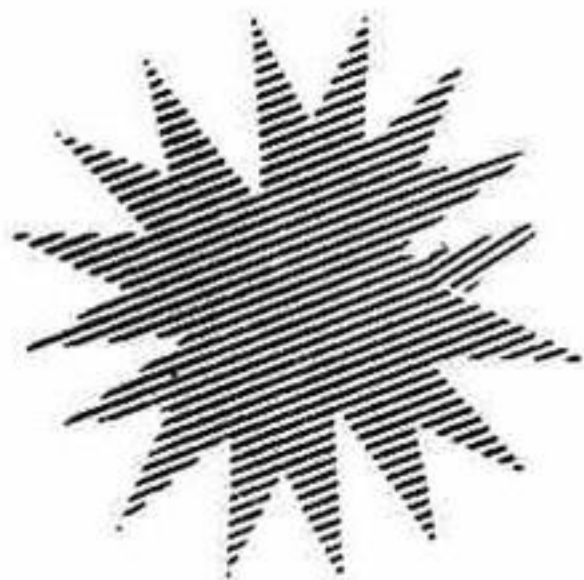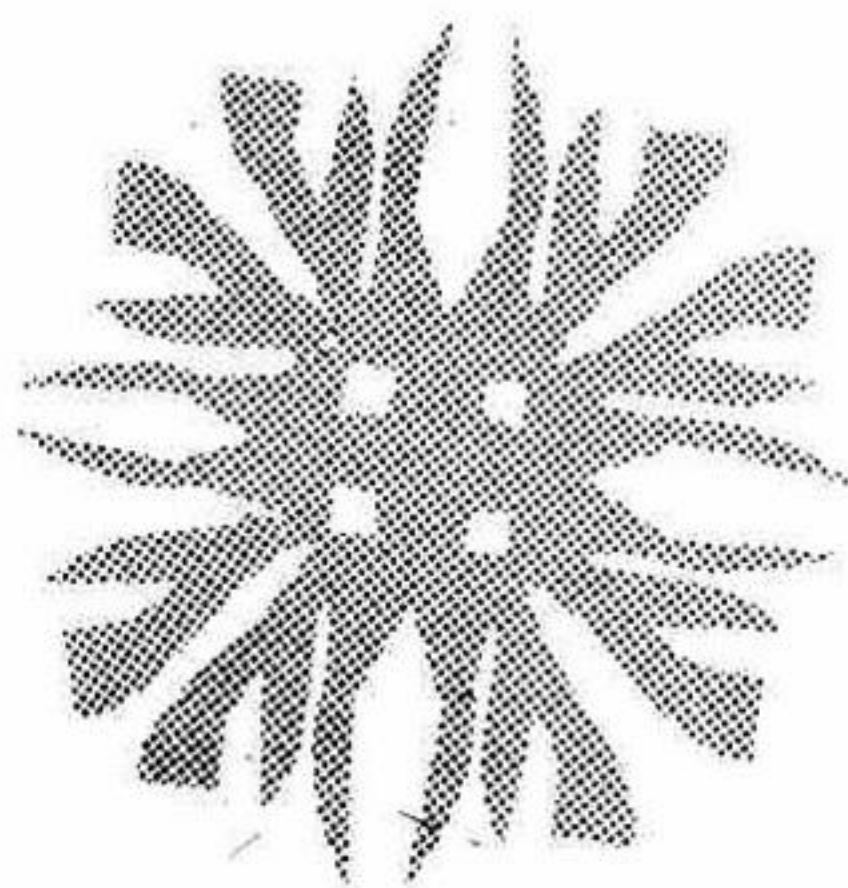
شراب اور شہد

اپریل کی وہ صبح کوئی ایسی غیر معمولی صبح تو نہ تھی۔ یوں ہی پژمردہ اور پھیکی پھیکی سی روشنی کمرے کے پُرانے قالین کے ایک حصّہ کے نقش ونگار کو واضح کر رہی تھی۔ انگلستان آنے کے بعد ایسی نہ جانے کتنی صبحیں دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا ہر رات سونے سے پہلے میں اس کھڑکی کے سرخ پردے ہٹا دیتا جو مشرق کی طرف کھلتی تھی۔ کسی روز اتفاقاً اگر چمکیلا و تابناک سا سورج نکل آتا تو میں دور اُفق پر نگاہیں جمائے سوچتا کہ اوپر اٹھتے ہوئے اس چمکتے گول سورج سے ذرا نیچے، یہاں سے چند ہزار میل دور، میرا گھر ہے، میرے ماں باپ اور بہن بھائی ہیں۔ "دیوار پر کتنی دھوپ چڑھ آئی اور ابھی ناشتہ ختم نہیں ہوا!" ہماری امّی اکثر یہ جملہ کہا کرتی تھیں۔ اگر ہم میں سے کوئی دیر سے اٹھتا اور دھوپ انگور کی بیل کو چھو رہی ہوتی تو یقین ہو جاتا تھا کہ آج امّی کی خفگی ضرور ناشتہ کے ساتھ ملے گی۔

مگر اپریل کی اُس صبح مجھے اپنے گھر کے چبوترے پر پھیلی انگور کی بیل کا خیال نہیں آیا تھا۔ بلکہ میں سوچ رہا تھا ایک غیر معمولی شخص کے بارے میں جو اس دن پیدا ہوا تھا۔ مجھے مختلف لوگوں کی سالگرہ خواہ مخواہ یاد رہ جاتی ہے۔ معمولی سے جاننے والوں کو میں سال گرہ کی مبارک باد کا کارڈ بھیج دیتا ہوں۔ "پیسے کی بربادی" امّی سنیں تو کہیں مگر کتنا اچھا لگتا ہے کہ ایک صبح آپ اٹھیں تو ڈاک سے متعدد کارڈ آئے ہوں۔ کتنا پیارا خیال ہے کہ کوئی ہمیں یاد رکھتا ہے۔ کوئی پچھتر سال پہلے اپریل کی ۲۰ تاریخ کو آسٹریا کے ایک غریب گھرانے میں ایک نہایت ناتواں سا لڑکا پیدا ہوا تھا۔ اس کے تین بہن بھائی اس کی پیدائش سے پہلے ہی فوت ہو چکے تھے۔ صدمے اٹھائے ہوئے ماں باپ خوف زدہ تھے کہ جانے اس کا کیا حشر ہو گا اتنا کمزور سا تو لگتا تھا۔ مگر جب یہ لڑکا بڑا ہوا تو ساری دنیا اس سے پریشان تھی۔ اڈولف ہٹلر ——— یہ نام لیتے وقت آج بھی لوگوں کے لہجے میں نفرت پہچاننا مشکل نہیں۔ ایسی نفرت خوف کا نتیجہ ہوتی ہے۔ مجھے وہ گائیڈ یاد آگیا جو لندن کے وہ مقامات بتلاتے ہوئے جہاں دوسری جنگ میں بمباری ہوئی تھی، تنفّر آمیز جذبات کی شدت سے "اڈولف ہٹلر" کا نام بڑبڑاتے ہوئے خاموش ہو گیا تھا۔

اس دن مجھے اپنے ایک انگریز دوست برائن کی شادی میں جانا تھا۔ برائن بڑا پُر لطف آدمی ہے۔ کتابوں سے نکلا ایک اچھا خاصہ کردار۔ اسے سب ہی لوگ چاہتے ہیں اور اس کے خلوص سے متاثر ہوئے بغیر کوئی نہیں رہ سکتا۔ لمبے لمبے بالوں اور موٹے موٹے شیشوں کی عینک والے برائن کی شادی

میں جانے کتنے لوگ شریک ہوں۔ میں نے سوچا انگلستان میں شادی میں شرکت ایک اچھا خاصہ ہنگامہ ہے۔ مرد اپنے بہترین سوٹ پہن کر کوٹ کے کالر میں پھول لگاتے ہیں اور عورتیں گھنٹوں بال جما کر خوب صورت ترین پوشاک زیب تن کر کے، نئی نئی وضع کے ہیٹ پہنے چرچ آتی ہیں۔ اس ملک میں ہر شخص مصروف ہے۔ مگر دلہا دُلہن کو چرچ سے باہر نکلتا دیکھ کر اکثر راہ گیر رُک جاتے ہیں۔ اگر دولہا اچھا ہو تو مجمع میں کھڑی لڑکیاں دُلہن میں خرابی ڈھونڈنے کی کوشش کرتی ہیں۔ جیسے کہنا چاہتی ہوں کہ کاش ہم اس کی جگہ ہوتے!

میں چرچ کے قریب ہی تھا کہ مجھے بلبیر اور اشوک مل گئے۔ دونوں کالے سوٹ پہنے بڑے سج رہے تھے۔ چرچ کے سامنے برائن دوستوں کے ساتھ کھڑا ایک فوٹوگرافر کے لئے پوز دے رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی پکارا کہ جلدی آؤ۔ ہم تینوں لپک کر گروپ میں شامل ہو گئے۔ مجھے برائن نے اپنے دائیں بازو کھڑا کیا "نہرو سوٹ میں تم اکیلے ہی آئے ہو۔ کالی شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ میں نے صرف ایسے ہی جملے سننے کے لئے پہنے تھے۔ فوٹوگرافر کے کہنے پر ہم سب مسکرانے لگے تھے۔

برائن اور ایڈنا ساری زندگی ساتھ رہنے کی قسمیں کھاتے رہے۔ ایک دھیمی دھیمی موسیقی سے چرچ گونج اٹھا اور دلہا دُلہن ہاتھ میں ہاتھ تھامے مہمانوں کی مسکراہٹیں قبول کرتے باہر آ گئے۔ نہ جانے کتنی کاروں کی ایک لمبی قطار سب مہمانوں کو ایک خوش نما بنگلے تک لے آئی جہاں ضیافت کا انتظام تھا۔

ہال مہمانوں سے کھچا کھچ بھر گیا تھا اور ابھی لوگ آرہے تھے۔ میں لمبے ترنگے، خوب رو نارویجین لڑکے آئیور اور اس کی کزن مارت کی طرف بڑھا۔ " وردآن ہار دیودے " میں نے ان کی زبان میں ان کی خیریت دریافت کی۔

" باربرا تھاک " مارت کہہ رہی تھی مگر آئیور کی نگاہیں میرے پیچھے کسی ہلتی ہوئی چیز پر جمی تھیں۔ میں نے ذرا مڑ کر دیکھا۔ سنہری بال بڑی نفاست سے جمے ہوئے میرے برابر سے گزر گئے اور نہایت بھینی خوشبو سے ماحول چند لمحوں کے لئے مہک اٹھا۔ وہ لڑکی ایک شوخ رنگ کا نیلا لباس پہنے تھی۔ " واکاپیکا " آئیور نے بتلایا۔ یہ رسم ہم دوستوں میں ایک اطالوی لڑکے البرتو نے شروع کی تھی۔ وہ جب بھی " بیلارگانسا " کا نعرہ لگاتا ہم سب سمجھ جاتے کہ کوئی خوب صورت لڑکی قریب میں ہے۔ لنکا کے کرکٹ کے کھلاڑی مال سری نے " ہوندا گیانی " کو مشہور کر دیا تھا اور مشرقی افریقہ میں ساری زندگی گزارنے والا پنجابی ببیر ہر خوب صورت لڑکی کو " موسی جی " کہا کرتا تھا۔ آئیور جھک کر بڑے رازدارانہ طور پر کہہ رہا تھا " میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اتنی حسین وجمیل لڑکی پورے کرۂ ارض پر نہیں " اسے موٹے اور ثقیل الفاظ استعمال کرنے کا بڑا شوق تھا۔

میں دوستوں سے ملتا، خیریت پوچھتا کمرے کے دوسرے حصے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ شوخ رنگ کا نیلا لباس پہننے والی لڑکی کے قریب کھڑا ہوا شخص مجھ سے مخاطب ہوا " تم اس لباس میں ایک ہندوستانی مہاراجہ لگتے ہو " شکریہ ادا کرتے ہوئے میں نے کہا کہ " آج سے پہلے میں آپ سے

کبھی ملا نہیں" نہایت ہی دلکش لہجے میں سنہری بالوں والی لڑکی مجھ سے مخاطب ہوئی "میں اور اڈولف شادی میں شریک ہونے کے لئے آج ہی جرمنی سے آئے ہیں۔" پھر بہت ہی سادگی سے اس نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "میں اڈولف کی بیوی ہوں۔" اڈولف نام پر میں یوں ہی چونک سا گیا۔ عجیب بات تھی۔ اسی صبح میں ایک جرمن اڈولف کے بارے میں سوچ رہا تھا اور دوسرے سے ملاقات ہو گئی۔ اکثر جرمن لوگوں سے ہٹلر کا ذکر کرنا مناسب نہیں ہوتا اور اس کا وقت بھی کہاں تھا؟ ایک خوب صورت ہاتھ میری جانب بڑھ چکا تھا۔ میں نے اس نرم ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا "مگر آپ تو مجھے جرمن نہیں معلوم ہوتیں۔" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی "میں فرنچ ہوں۔ آپ سوچیں گے کہ میری ایک جرمن سے کیسے شادی ہو گئی؟ تو فرانس اور جرمنی کی لڑائی تو ایک حادثہ تھی، ہماری اصل لڑائی تو انگلستان سے رہی ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "جہاں بھی دو غیر انگریز ایک جگہ اکھٹے ہوئے انگلستان پر جملے بازی شروع ہو جاتی ہے۔"

اتنی دیر میں موسیقی شروع ہو چکی تھی اور فرش پر کئی جوڑے ناچ رہے تھے۔ رقص نہ کرنے والوں نے ہٹ کر جگہ بنا دی تھی۔ وہ بے تکلف انداز میں کہہ رہی تھی "تمہارا لباس مجھے بہت پسند آیا۔ میں نے آج تک کسی کو یہ لباس پہنے نہیں دیکھا۔ تمہارے ساتھ رقص کرنے میں کافی لطف آئے گا۔"

میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اڈولف سے اس کی بیوی کے ساتھ رقص کرنے کی اجازت چاہی۔ یورپ آئے ہوئے مجھے کتنا عرصہ

ہو گیا تھا مگر کبھی رقص پر کسی لڑکی نے پہل نہ کی تھی۔ دو لڑکیاں ایک دوسرے کے ساتھ ناچ لیں گی، مگر کسی لڑکے کو رقص کے لئے راغب نہ کریں گی۔ یہ بات ہی کچھ اور تھی۔ میں مسرور تھا اور مغرور بھی۔ میں نے اچٹتی ہوئی نگاہ ہال پر ڈالی۔ بلبیر اور اشوک بھی رقص کر رہے تھے مگر ان کے ہم رقص ایسے نہ تھے۔ آئیوریوں تو مارت کے ساتھ ناچ رہا تھا مگر اس کی نگاہیں ہم پر جمی تھیں۔

"تمہارے حُسن کو کس نام سے مخاطب کیا جائے؟" میں نے اس کی شفاف نیلی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"مسز اِشنائیدر مگر تم مجھے صرف فرانسواس کہو" وہ یوں ہی ہنس پڑی مجھے خیال ہوا کہ اس کی مسکراہٹ بڑی دل کش تھی۔ یہ ہر بات پر ہنس دینے کی ادا اُسے اور کتنا حسین بنا دیتی ہے "تم یہاں کتنے دن اور ٹھیرو گی؟" میں نے پوچھا اس کی آنکھوں میں دو مشعلیں سی روشن تھیں۔

"بس کل صبح ہم چلے جائیں گے۔" جیسے اس خیال سے وہ اداس ہو گئی ہو۔

"نہیں کل تم کیسے جا سکتی ہو۔ ابھی تو سب لوگوں نے تمہیں دل بھر کر دیکھا بھی نہیں ہے۔" میں نے اس کا ہاتھ آہستہ سے دبا دیا

"تم نے سب کی طرف سے بولنے کا فرض اپنے ذمّہ کیوں لے لیا؟" اس نے چھیڑتے ہوئے کہا۔ حُسن خراج مانگے بغیر نہیں رہ سکتا۔

"اگر میں تمہاری خوب صورتی سے متاثر نہ ہوتا، فرانسواس، تو کیا میں تمہارے ساتھ رقص کرتا ہوتا جب کہ میری دوست اسی کونے میں کھڑی مجھے اور تمہیں گھور رہی ہے؟" اس کی کمر کے اطراف میرا بازو

اور تنگ ہو گیا تھا۔

"اور میرا شوہر ——— اڈولف بے چارہ بھی تو اکیلا کھڑا ہے۔"
وہ پھر ہنس پڑی۔ موسیقی ذرا دیر کو رُکی تو وہ کہنے لگی "چلو کچھ پئیں۔ مجھے شراب بہت پسند ہے، اور وہ بھی فرانسیسی شراب۔ میں کچھ پی کر زیادہ اچھا ناچ لیتی ہوں۔"

ہم بار کی طرف آ گئے۔ مجھے ڈیوبونے کھانے سے پہلے پسند ہے اور بوژولے کھانے کے ساتھ مگر اب ——— اب تو میں ڈرائی مارٹینی پیوں گی اور تم؟ کیا تم نہیں پیو گے؟ فرانسواس کی آواز سن کر میں سوچنے لگا کہ کیا وہ مجھ سے سوال کر رہی تھی یا مجھے حکم دے رہی تھی۔

"ڈرائی مارٹینی ——— مادام کے لئے" میں نے بارمین سے کہا "میں تو نہیں پیوں گا۔ آج تو تمہیں صرف دیکھ لینا ہی کافی ہوگا۔ میں نے پہلے کبھی فرانسیسی شراب کو نیلے لباس میں رقص کرتے نہیں دیکھا۔" فرانسواس ہنس پڑی پھر یکایک سنجیدہ ہو کر کہنے لگی "تم اتنی اچھی باتیں نہ کرو نہیں تو مجھے جرمنی واپس لوٹتے دُکھ ہوگا۔"

اس نے گلاس میری طرف اٹھا کر سُرخ شراب چکھی "ہماری تمہاری ملاقات کی یاد میں۔" وہ شراب کی چسکیاں لیتی رہی۔ ہم دونوں خاموش کھڑے رہے جیسے کچھ کہنے میں پہل کرنے کا کسی کا ارادہ نہ ہو تھوڑی دیر میں موسیقی پھر شروع ہو چکی تھی۔ میں نے گلاس اس کے ہاتھ سے لے کر میز پر رکھ دیا۔ ابھی آدھا بھی خالی نہیں ہوا تھا۔ "آؤ رقص کریں۔ ناچنے کے بہانے تمہارا مہکتا جسم میرے قریب تو آ سکتا ہے مجھے یہ خوشبو پسند ہے۔"

"تم عورت کا دل خوش کرنے کا گُر جانتے ہو۔ یہ میری پسندیدہ خوشبو ہے۔ ماگبرف!" وہ خوش نظر آرہی تھی۔ اس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں، وہی جان لیوا روشن مسکراہٹ۔

"تمہیں تو نہ خوشبو لگانے کی ضرورت ہے اور نہ شراب پینے کی۔ بس لوگوں کو تمہیں دیکھ لینے دو اور وہ فریفتہ ہو جائیں گے ـــــ مگر ـــــ تم یہاں کچھ دن اور ٹھہر جاؤ۔"

"تم یہ میرے شوہر سے کہو شاید وہ تمہاری بات مان جائے۔"

ہم رقص کرتے کرتے کمرے کے اس طرف آگئے جہاں اڈولف کھڑا میز سے اٹھا کر کچھ کھا رہا تھا۔ ہمیں اپنی طرف آتا دیکھ کر اس نے نظریں ہٹا لی تھیں۔

"اڈولف تمہاری بیوی بہت اچھا رقص کرتی ہیں، مگر وہ کہتی ہیں کہ تم کل صبح واپس جا رہے ہو۔ کچھ اور رُک کیوں نہیں جاتے۔ انگلستان میں آج ہی تو بہار آئی ہے۔ آج ہی تو پھول کِھلے ہیں۔" میں نے فرانسواس کے گلابی چہرے پر پھیلتی ہوئی مسکراہٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہمارا بچہ بہت چھوٹا ہے۔ اسے ہم عزیزوں کے ساتھ چھوڑ آئے ہیں۔" پھر وہ اپنی بیوی سے مخاطب ہوا "کیا میں آپ کے ساتھ ناچنے کا شرف حاصل کر سکتا ہوں؟" میں ہٹ گیا اور وہ دونوں رقص کرتے کمرے کے وسط میں چلے گئے۔ کبھی کبھی دو فرانسیسی آنکھوں کی نیلاہٹ میری طرف متوجہ ہو جاتی۔ بلبیر قریب آگیا۔ ایک نئی سی لڑکی اس کے ساتھ تھی۔ اس نے تعارف کرایا "یہ انا بیلا ہے، لندن سے آئی ہے، شادی میں شریک ہونے۔"

انا بیلا نے بتلایا کہ دُلہن ایڈنا اس کی بہترین دوست ہے۔ وہ مجھ سے کہہ رہی تھی "تمہارا لباس دیکھ کر مجھے وہ فلم یاد آتا ہے جو گاندھی جی کی زندگی کے بارے میں بنایا گیا تھا۔ تمہاری اس کے بارے میں کیا رائے ہے؟" یہ سوال مجھ سے پچاس مرتبہ پوچھا جا چکا ہے۔ نہ مجھے سوال میں دلچسپی تھی اور نہ سوال پوچھنے والی میں۔ میری نگاہیں تو فرانسواس کو ڈھونڈھ رہی تھیں۔ "اچھا خاصہ فلم تھا۔ بہتر بھی بنایا جا سکتا تھا۔" میں نے نپا تُلا جملہ کہہ دیا۔

براٹن ایڈنا اور فوٹو گرافر کو لے کر آ گیا۔ شراب کام کر چکی تھی اور وہ دونوں بہت مسرور تھے۔ "آؤ اب تم یہاں آ کر تصویر کھنچواؤ، ایڈنا تم بیچ میں کھڑی ہو اور اب کہو چیز۔" ہم سب نے ایک ساتھ "چیز" کہا اور فلیش کی روشنی ایک لمحہ کے لئے ماحول کو چندھیا گئی۔ "چیز" کہنے سے ہر ایک کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ اُدنگھ جاتی ہے۔ انگلستان میں ہر شخص تصویر کھینچتے وقت فرمائش کرتا ہے کہ آپ "چیز" کہیں چاہے آپ کو پنیر پسند ہو یا نہ ہو۔ بالکل اسی طرح جیسے دنیا میں ہر جگہ مائیک ٹیسٹ کرتے وقت کہتے ہیں "ہلو، ایک، دو تین . . . ."

براٹن اور ایڈنا اب کسی اور کے ساتھ کھڑے "چیز" کہہ رہے تھے۔ میں کمرے کے اس حصہ کی طرف بڑھنے لگا جہاں کھانے کی چیزیں رکھی تھیں۔ مسز آدم نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے بلایا "تم یہاں بیٹھ کر مجھ سے باتیں کرو۔ میں بہت دیر سے تمہاری حرکتوں کو گھور رہی ہوں!" ان کے بوڑھے چہرے پر ایک شفیق سی مسکراہٹ تھی۔ جوانی میں یہ بہت

شریر رہی ہونگی جب ہی تو حضرت آدم ان کے چکّر میں آگئے تھے۔

میں نے فرانسواس کو کھانے کی میز کی طرف بڑھتے دیکھا۔"مسز آدم میں آپ کے لئے کاجو اٹھا کر لاتا ہوں۔"

"جلدی لانا کہیں دیر نہ ہو جائے۔" جہاں دیدہ مسز آدم فوراً معاملے کی تہہ تک پہنچ گئیں۔

"اچھّا ہوا تم مِل گئے" فرانسواس میرے پاس آکر رُکی "میں تمہیں کب سے ڈھونڈھ رہی تھی۔"

"نہ جانے کتنی صدیوں سے میں یہاں کھڑا تمہاری راہ دیکھ رہا ہوں۔" میں نے شکایت کی۔

"آؤ کچھ کھائیں" اس کے لہجے میں تحکّم والتجا دونوں بڑے مجبور کر دینے والے انداز میں ملے جلے تھے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ مسز آدم مسکرا رہی تھیں، جیسے کہہ رہی ہوں تم تو کاجو لینے گئے تھے۔

"وعدہ کرو تم جرمنی ضرور آؤ گے" فرانسواس کا لہجہ سنجیدہ تھا۔

"مگر اتنی بڑی جرمنی میں میں تمہیں ڈھونڈوں گا کیسے؟" میں نے کہا۔ اس دعوت کو قبول کرنے کے لئے مجھے ایک لمحہ کے لیے بھی سوچنا نہ پڑا۔

"میں تمہیں اپنا پتہ لکھ دیتی ہوں ـــــــ ابھی اسی وقت یہیں۔ ذرا اپنا قلم تو دو" فرانسواس جھک کر میز پر لکھنے لگی اور میں اس کی گردن پر سنہری رووَں کی چمک دیکھنے لگا۔ پتہ پڑھتے پڑھتے میں اس کے قریب آگیا۔ ماگرف کی خوشبو نے جیسے لپیٹ لیا ہو۔ ایک چھوٹی سی ریشمی دستی پر بڑی احتیاط سے اس نے اپنا پتہ لکھا تھا۔

"تو تم ہائیڈل برگ میں رہتی ہو؟" میں نے دستی پر لکھا پتہ پڑھتے ہوئے اس سے کہا۔

"کیوں، کیا تم ہائیڈل برگ ہو آئے ہو؟"

"نہیں میرے انکل وہاں پڑھتے تھے اڈولف ہٹلر کے مشہور ہونے سے بہت پہلے۔ وہ کہتے تھے کہ ہائیڈل برگ بہت تاریخی شہر ہے بہت خوب صورت ہے۔ میں نے سوچا تھا ایک بار وہاں جاؤں گا مگر اب تو وہاں جانا ضروری ہو گیا ہے۔"

شرارت سے وہ ہنسی "نہیں آنا چاہتے ہو تو نہ آؤ۔ مں نے کوئی مجبور تو نہیں کیا۔" اس کی آنکھیں بھی ہنس رہی تھیں۔ ان کی چمک بڑھ سی گئی تھی۔

"تم جانتی ہو فرانسواس اور بڑی اچھی طرح جانتی ہو کہ میں آئے بنا نہیں رہ سکتا۔ بہت دیر سے ہم کھڑے ہیں چلو رقص کریں۔ تمہارا شوہر کیا سوچے گا۔" ہم رقص کرتے دوسرے جوڑوں کے درمیان آ گئے۔ وہ بھینی بھینی خوشبو قریب سے قریب تر ہوتی گئی۔

"اڈولف جلنے والے مردوں میں سے نہیں۔"

"تم مرد کی فطرت سے واقف نہیں۔ اس کے غرور کو ٹھیس لگ جائے یہ اسے کبھی گوارا نہیں ہوتا۔"

"میں تو بہت جلد جل اٹھتی ہوں اگر تم کسی اور لڑکی کے ساتھ ناچو گے تو میں ناراض ہو جاؤں گی۔"

"تم سے ملنے سے پہلے اسی ہال میں کتنی ساری لڑکیاں تھیں۔ مگر اب

تو صرف تم ہی تم ہو۔ جیسے چاند نکل آنے سے ستارے ماند پڑ جاتے ہیں۔" مجھے اردو شاعری کی خوبیاں زبانی یاد تھیں۔ مشرق کی اس لن ترانی سے وہ بھی خوش دکھائی دیتی تھی۔

"آؤ چلو باہر لان پر رقص کریں، کھلی ہواؤں میں، لوگوں کی نگاہوں کی پرواہ کیے بغیر میں نے شیشے کا دروازہ کھولا اور فرانسواس کو باہر لے آیا۔ جوانی کا احساس جب محبت کے احساس میں گھل مل جاتا ہے تو خطرات کا مقابلہ کرنے کے ارمان دل میں انگڑائیاں لینے لگتے ہیں۔ شام ڈھل چکی تھی اور اطراف کے گھروں میں روشنیاں جاگ اٹھی تھیں۔ کیاریوں میں نو شگفتہ پھول فرانسواس کی طرح حسین نظر آ رہے تھے۔ موسیقی کی اونچی دھنیں دبیز پردوں کو ہٹاتی کھلے دروازے سے باہر نکلتے نکلتے دھیمی ہو گئی تھیں۔

فرانسواس نے دونوں بازو میری گردن میں حمائل کر دیئے اور اپنا سر میرے شانے پر ٹکائے ہلکے ہلکے رقص کرتی رہی جیسے پر سکون دریا پر ایک کشتی ڈول رہی ہو۔

پردہ ہٹا کر کوئی باہر نکل آیا۔ میں نے دور سے پہچان لیا۔ یہ اڈولف تھا۔ فرانسواس کے کان میں میں نے آہستہ سے کہا کہ تمہارا شوہر تمہیں ڈھونڈتا لان تک پہنچ گیا ہے، مگر وہ کہیں خوابوں کی بستی میں تھی۔ ویسے ہی سر رکھے وہ آہستہ آہستہ جھولتی رہی۔ اڈولف بالکل قریب آ گیا۔

"تو آپ لوگ یہاں ہیں۔" اس کے لہجے میں مصنوعی خوش اخلاقی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ آنکھیں اندھیرے میں کچھ یوں چمک رہی تھیں جیسے فولاد میں ڈھلی ہوں۔

"آپ ہائیڈل برگ ضرور آئیے گا"۔ جیب سے بٹوہ نکال کر اپنا کارڈ میری طرف بڑھاتے ہوئے اس نے کہا "اور یہ رہا میرا پتہ"۔

"تمہیں دیر ہو گئی اڈولف ڈیر ـــــ میں انہیں اپنا پتہ دے چکی ہوں"۔ فرانسواس کی آواز میں نہ طنز تھا نہ تاسف، نہ خوف نہ خوشی۔ ایک عجیب تکلیف دہ خاموشی چھا گئی۔ خاموشی جس میں موسیقی کی دُھنیں ڈوب گئیں۔ ہال میں بھرے ہوئے مہمانوں کا شور وغوغا ڈوب گیا۔ پھولوں کے رنگ ڈوب گئے۔ ماگرف کی خوشبو ڈوب گئی۔

"اگر آپ کی بیوی آپ کا پتہ کسی اجنبی کو اس طرح دے دے تو آپ کیا کریں گے؟" اڈولف کا سوال اس کے لہجے کا دُکھ نہ چھپا سکا۔

میں اڈولف اِشنائی دَر کی آواز سن کر چونک گیا اور جواب سوچنے لگا۔ آسمان پر اکا دُکا تارے بکھرے تھے۔ اطراف کے گھروں کی روشنیاں کہیں دُور دکھائی دے رہی تھیں۔ کیاریوں میں پھولوں کا حسن خوابیدہ سا تھا۔ فرانسواس اسی حال میں تھی، اس ماحول سے کہیں بہت دُور۔ سنہری بالوں کی مہک میں وہی کشش تھی۔ میرے دل کی دھڑکن کی بے ربطگی پر شاید اس کو لطف آ رہا ہو گا جب ہی تو کنکھیوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے وہ مسکرا رہی تھی۔ اس عالم میں بھی، میں نے سوچا کہ کس قدر حسین ہے یہ فرانسوائز کس قدر نڈر اور کتنی ظالم ـــــ میری بے بسی پر خوش ہو رہی ہے۔

"میں ـــــ میں تو شاید خاموش ہی رہوں، خاموشی ہزار مشکلوں کو حل کر دیتی ہے"۔ میں نے بہ مشکل سکوت توڑا۔

"آپ سچ کہتے ہیں"۔ اڈولف کی فولادی آنکھوں میں اچانک ایک

نمناک اُداسی اتر آئی۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہال کی طرف لوٹ گیا۔

"فرانسواس" میں نے اس کا چہرہ اپنی طرف اٹھاتے ہوئے کہا "میری ایک بات پر یقین کرو گی؟" اقرار میں اس نے سر ہلایا۔ تیزی سے چلنے والی زبان خاموش تھی۔ نہ جانے یہ خاموشی طوفان کی آمد کا پیش خیمہ تھی یا طوفان کے خاتمہ کا اعلان۔ "فرانسواس! تم سے آج یوں اچانک مل کر مجھے یہ غم جاتا رہا کہ میں نے اب تک کسی سے محبّت نہ کی۔ کتنے اور لوگوں نے بھی تمہارے حُسن کی تعریف کی ہو گی۔ تم بہت حسین ہو، بہت ہی زیادہ اور تمہارے حُسن کی سب سے بڑی کشش یہ ہے کہ مجھ سے ہم کلام ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔ قسمت نے کبھی مجھے اس قدر جھوم کر نہیں دیکھا —— مگر ——"

میں مناسب الفاظ ڈھونڈنے کے لیئے رُکا اور جیب میں فرانسواس کی دی ہوئی ریشمی دستی ٹٹولنے لگا۔ عجیب بات تھی۔ اُس روز سے پہلے میرے لئے کوئی بھی فیصلہ کرنا دشوار ہوتا تھا۔ ہر چھوٹی سی بات پر گھنٹوں غور کرتا تھا مگر اُس روز صرف چند لمحوں میں، میں نے زندگی کی سب سے بڑی مشکل گتھی کو سلجھا لیا تھا۔ محبت انسان کی شخصیت کے کئی روپ نکھار دیتی ہے۔

"مگر —— مگر کیا؟" فرانسواس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔ اس کا بایاں ہاتھ اب بھی میرے دائیں ہاتھ میں تھا۔ اس کا جسم اب بھی میرے جسم کو جگہ جگہ چھو رہا تھا۔

"مگر یہی کہ میں ہائیڈل برگ نہیں آؤں گا۔" میں نے وہ ریشمی دستی فرانسواس کے ہاتھ میں دے دی جس پر دو ڈھائی گھنٹے پہلے اس نے اپنا پتہ لکھا تھا۔ دوبے جان سے ہاتھ میرے ہاتھوں میں بھینی مہک والی ہلکے

نیلے رنگ کی دستی تھامے تھے۔

"کیا یہ ضروری ہے، فرانسواس!" مجھ سے اپنی ہی آواز نہ پہچانی گئی۔ ایسا لگا جیسے کوئی اور بول رہا ہو۔ "کہ ہم اور تم پھر ایک بار ملیں؟ کیا آج کی شام ایک مکمّل شام نہیں؟ میں تمہارے حُسن کو اپنی طرف متوجہ پاکر کس قدر خوش ہوں۔ کیا صرف یہ خیال، بلکہ یہ یقین کہ میں نے تمہیں ٹوٹ کر چاہا تھا کافی نہیں۔ کیا یہ وقت جو میں نے تمہاری قربت میں گزارا ہے ہمیشہ کے لئے میری یادوں کو معطّر نہ کر دے گا؟ کیا ساتھ بِتائے ہوئے ان لمحوں میں وہ مٹھاس اور مستی نہیں جو صرف تم سے وابستہ ہے۔"

فرانسواس کی شفاف آنکھوں کی نیلاہٹ ایک دم دُھندلا گئی۔ ایسا لگا جیسے وہ رو پڑے گی "آؤ ہم ایک بار پھر رقص کریں۔" اس نے میرے قریب آکر آہستہ سے کہا مگر ف کی بھینی بھینی خوشبو نے ہمیں پھر سے یاد دلایا کہ ہال میں ابھی تک موسیقی گونج رہی تھی۔

"پُراسرار اجنبی، تم نے مجھے اپنا نام بھی نہ بتلایا۔" اس کے اداس لہجے میں بڑی معصوم سی شکایت تھی۔

"نام جان کر کرو گی بھی کیا۔ مجھے تم کسی نام سے بھی پکار لو، جو تمہیں پسند ہو۔"

"مشعل، میں تمہیں مشعل پکاروں گی۔ یہ بالکل فرانسیسی نام ہے انگلستان میں اسے مائکل کہتے ہیں۔ سمجھے مشعل۔" اس کی شوخی واپس لوٹ رہی تھی۔

"ہمارے ملک میں مشعل روشن کر دینے سے تاریکی چھٹ جاتی ہے بالکل جیسے تم سے مل کر رفاقت کی کمی کا احساس میری زندگی سے جاتا رہا۔"

"مشعل" وہ انگارہ سے سُرخ ہونٹوں نے میرے بہت قریب ہو کر کہا۔ ہم دیر تک رخسار سے رخسار ملائے رقص کرتے رہے۔ ایک مرمریں جسم میری باہوں میں

جھولتا رہا۔ ساری کائنات مجھ سے دُور ہٹتی رہی۔

"فرانسواس! اب جب موسیقی رُکے گی۔ میں تمہیں ہال میں واپس لے جاؤں گا۔ مہمانوں کے ہجوم میں تم مجھے نہ ڈھونڈھ پاؤ گی۔ میں تمہیں الوداع بھی نہیں کہوں گا۔ بس میں چلا جاؤں گا۔ تم اس بات پر رنج نہ کرنا کہ ہم نے مستقبل کے منصوبے نہ بنائے، آئندہ ملنے کے وعدے نہ کئے، ایک دوسرے پر جان دینے کی قسمیں نہ کھائیں، بلکہ اس بات پر خوش ہونا کہ ہم تم ملے تھے ——— گو تھوڑے ہی عرصے کے لئے سہی مگر خلوص کی پوری گہرائی کے ساتھ!"

رات یقیناً ڈھل چکی ہوگی تب ہی تو ہواؤں میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ ستارے بھی زیادہ چمکنے لگے تھے۔ میں فرانسواس کو بازو سے سہارا دئے ہال میں واپس لے آیا۔ اڈولف بار کے قریب اکیلا کھڑا پی رہا تھا۔ "ڈرائی مارٹینی پلیز ——— مادام کے لئے!" میں نے بارمین کو ہدایت دی اور اڈولف یا فرانسواس کی طرف دیکھے بغیر باہر نکل آیا۔

کار موڑتے وقت ہیڈ لیمپس کی روشنی میں صرف ایک لمحہ کے لئے میں نے دیکھا کہ ہال کی ایک کھلی کھڑکی میں نیلا لباس پہنے ہوئے کوئی مجھے دیکھ رہا تھا۔ ایک نازک سا ہاتھ ہوا میں لہرا کر مجھے الوداع ——— نہیں نہیں الوداع نہیں بلکہ صرف شب بخیر کہہ رہا تھا۔ میں مسکرانے لگا جیسے زندگی میں کسی نے شہد گھول دیا ہو۔

پرچھائیاں

جیوتی چیٹرجی کو آج پہلی بار مسز ہیکز بمر کی شفاف، دھلی ہوئی نیلی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کا موقعہ ملا تھا۔ وہ انھیں غور سے دیکھ رہا تھا اور انہیں پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جیوتی نے جانے کتنی بار مارٹینا ہیکز بمر سے کہا تھا کہ وہ اپنی ماں سے ملوائے مگر جیوتی کو آج سے پہلے کبھی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ مارٹینا اس کے برابر کھڑی ہوئی تھی اور اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہو چلے تھے۔ جیوتی مارٹینا کو بے شمار مرتبہ روتے ہوئے دیکھ چکا تھا، وہ بے شمار مرتبہ روتی ہوئی مارٹینا کو ہنسا بھی چکا تھا، اس کو گلے سے لگا کر اس کے رخساروں پر بہتے ہوئے آنسوؤں کا ذائقہ چکھ چکا تھا۔ مگر آج اس نے مارٹینا کو ہنسانے کی کوشش نہ کی اور نہ ہی اس کو اپنے قریب کھینچ کر گلے لگایا۔ آج وہ خاموشی سے مارٹینا کی ممی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انہیں غور سے دیکھ رہا تھا۔

تھوڑی دیر پہلے ہی وہ مارٹینا کے ساتھ بارش سے بچنے کے لیے ایک

چھوٹے سے شراب خانے میں بیٹھا گرم اور تلخ کافی پی رہا تھا۔ صبح کا وقت تھا اس لئے زیادہ بھیڑ بھاڑ نہ تھی، شور نہ تھا۔ بیئر کے گلاسوں کے ایک دوسرے سے ٹکرانے کی آواز نہ تھی، طرح طرح کی سگریٹوں سے اُٹھتے ہوئے نیلے مرغولے نہ تھے۔ اس پرسکون ماحول میں جیوتی نے سوچا بھی نہ تھا کہ اپنی ممی سے ملانے کے بعد مارٹینا بے ساختہ رونے لگے گی اور وہ ہچکیاں لیتی ہوئی مارٹینا کو چپ کرانے کی کوشش بھی نہ کرے گا۔

وہ دونوں شراب خانے سے باہر اس ٹیڑھی میڑھی پتلی گلی میں نکل آئے جس کے دونوں طرف اونچی اونچی عمارتیں تھیں۔ بارش اور تیز ہو چکی تھی اور سرد ہواؤں کے تیز خنجر جسم کو ہر طرف سے کاٹ رہے تھے حالانکہ جرمنی میں موسم گرما شروع ہو کر پورے دو ہفتے گذر چکے تھے۔

"لاؤ مارٹینا۔ تم اپنی پھولدار چھتری مجھے پکڑنے دو۔ ورنہ اس کی کسی تیلی سے تم میری کم از کم ایک آنکھ ضرور پھوڑ دو گی" اور مارٹینا نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے اپنی چھوٹی چھتری جیوتی کے ہاتھ میں تھما دی تھی اور انجانے میں ان دونوں کی ٹھنڈی انگلیاں کچھ اس طرح چھو گئیں کہ پرانی یادیں بیدار ہو گئیں۔ جس طرح بچے کسی خواب کو دیکھتے دیکھتے جاگ جاتے ہیں۔ مارٹینا بھی شاید اس لمس کے لیے تیار نہیں تھی اور وہ جیوتی سے ہٹ کر چلنے لگی۔ ان لکڑی کے تختوں کے نیچے جو ایک اونچی عمارت کی دیوار کی مرمّت کرنے کے لیے لوہے کے کھمبوں پر لگائے گئے تھے۔ پھر کچھ سوچ کر جیوتی کے قریب آ کر کہنے لگی۔ "دیکھنے کے لیے تو ایک آنکھ بھی کافی ہوتی ہے۔ جیوتی تم میری خاطر اپنا ذرا سا نقصان بھی برداشت کرنے کے لیے راضی نہیں ہوتے" مارٹینا نے یہ جملہ کچھ اس طرح کہا کہ ہر لفظ کے معنیٰ اور گہرے

ہو گئے تھے اور جیوتی فوراً کوئی جواب نہ دے سکا تھا۔ آج اس نے مارٹینا کے اس طنز کا بھی بُرا نہیں مانا۔ اب وہ محض اپنی لذّتوں کی تلاش میں سرگرداں نوجوان نہیں تھا۔ اب وہ بال بچے دار آدمی تھا، سر کے دو چار بال سفید ہو کر دور سے نظر آنے لگے تھے۔ اپنی ذمہ داریاں نبھانے کی کوشش میں وہ خود پسندی اور خود غرضی جیسی عیّاشیوں سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ اپنے خیالات میں گم وہ فٹ پاتھ پر مارٹینا کے ساتھ چل رہا تھا کہ اچانک مارٹینا نے جیوتی کی کہنی پکڑ کر اسے اپنے قریب کر لیا۔ ان کے عین سامنے فٹ پاتھ کے پتّھر اکھڑے ہوئے تھے اور ان کے قریب ہی سڑک پر سرخ چہرے اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں والا بہت لمبا اور بہت موٹا ایک ادھیڑ عمر کا مزدور ان پتھروں کا اس طرح دیکھ رہا تھا کہ جیسے بارش رکتے ہی اپنا کام پورا کرنے میں اسے دیر نہ لگے گی اور پھر کسی راہگیر کو فٹ پاتھ پر چلنے میں تکلیف نہ ہو گی۔

جیوتی چیٹرجی کئی برس بعد دوسری بار جرمن ڈیموکریٹک ری پبلک آیا تھا۔ اٹھارہ برس پہلے جب وہ یہاں پڑھتا تھا تو ہندوستان ان چند ممالک میں سے تھا جنہوں نے مشرقی جرمنی کی حکومت کو قبول کر لیا تھا مگر اب حالات بدل گئے تھے۔ پوری دنیا نے اس کو تسلیم کر لیا تھا۔ جیوتی نے تین چار دن میں ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ ملک ترقی کی راہ پر تیزی سے گامزن تھا۔ پہلے برلن میں اور آج اپنے پسندیدہ شہر ییناؔ میں جیوتی نے دیکھا تھا کہ ہر طرف تعمیری کام چل رہا تھا، نئی نئی سڑکیں تعمیر کی جا رہی تھیں، عوام کے رہنے کے لیے بڑی بڑی ہاؤسنگ کالونیاں بنائی جا رہی تھیں، پرانی عمارتوں اور عبادت گاہوں کو ان کی وہ عظمت لوٹائی جا رہی تھی جو دوسری جنگ عظیم کی اندھا دھند بمباری نے ان سے چھین لی

تھی۔ ویے نا کی قدیم اور مشہور فریڈرش شلر یونیورسٹی میں چار سال تک جیوتی نے سائنس کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ اسے یہاں کے گلی کوچے یاد تھے۔ یہاں کے چائے خانے اور شراب خانے یاد تھے، یہاں کے سب سے اونچے گرجے میں وہ نہ جانے کتنی بار تصویروں کی نمائش دیکھ چکا تھا۔ یہاں کا پلینے ٹریم، (PLANETARIUM) شاید دنیا میں سب سے پہلا تھا اور اس میں مارٹینا کے ساتھ بیٹھ کر اس نے ستاروں کی چمک دمک کو قریب سے دیکھا تھا۔ یہاں کے کالج، یہاں کی دکانیں، یہاں کے بڑے بڑے چوک سب ہی اس کی یادوں میں محفوظ تھے۔ جیوتی کی نظر اچانک سامنے دوائیوں کی دوکان کے اندر لگی ہوئی بڑی گھڑی تک اٹھ گئی اور اس نے مڑ کر مارٹینا سے کہا۔ "تھوڑا اور تیز چلو۔ پلیز۔ تمہاری ممی ہمارا انتظار کر رہی ہوں گی، پہلی ملاقات میں ہی میں ان کو ناراض نہیں کرنا چاہتا۔" جرمنی میں جیوتی کو سب سے زیادہ پریشانی وقت کی اتنی زیادہ پابندی سے ہوتی تھی۔ پانچ دس منٹ دیر ہوئی اور لوگ خفا ہو جاتے تھے۔ کتنی بار ایسا ہوتا تھا کہ ہوسٹل لوٹتے وقت رات کو آخری بس صرف اس وجہ سے نکل جاتی تھی کہ وہ مارٹینا کے سرخ ہونٹوں سے اپنے ہونٹ چند لمحے زیادہ دیر تک چپکے رہنے دیتا تھا یا شاید مارٹینا ہی جانتے بوجھتے اپنے ہونٹ جیوتی کے ہونٹوں سے الگ نہ کرتی تھی۔ آخری بس، گرمیوں میں یا سردیوں میں، خزاں یا بہار میں، رات کے گیارہ بج کر دو منٹ پر مارٹینا کے گھر کے قریب پیلے رنگ کے پوسٹ بکس کے اتنے پاس آکر رکتی کہ اگر بس کا کوئی مسافر چاہتا تو بس سے اترے بغیر خط پوسٹ کر سکتا تھا۔ اِکا دُکا مسافر اتنی رات کو بس سے اترتے یا سوار ہوتے اور بس روانہ ہو جاتی۔ یہ ہر رات کا معمول تھا۔ "روکو،

یہ بس روکو، پکارتے ہوئے جیوتی بس کے پیچھے دوڑتا مگر بس کی رفتار اور تیز ہوتی جاتی اور جیوتی بھاگتا ہوا گلی کے اس نکڑ تک لوٹ آتا جہاں مارٹینا یہ منظر دیکھ کر زور زور سے ہنس رہی ہوتی اور جیوتی مارٹینا کو لپٹا لیتا۔

"فرولین مارٹینا ہیکر۔ تمہارے ایک پیار کی اتنی بڑی سزا ملی ہے کہ اب آدھی رات کو مجھے پانچ کیلومیٹر پیدل ہی ہوسٹل تک جانا ہوگا۔"

"یہ سزا نہیں ہے ہر جیوتی چیٹر جی۔" مارٹینا اس کے گلے میں باہیں ڈال کر اس کو اپنے اور قریب لے آتی۔ "یہ ایک معصوم اور خوبصورت لڑکی کو پیار کرنے کا انعام ہے۔ تم کیسے عاشق ہو کہ بس چھوٹ جانے پر واویلا کر رہے ہو۔ بعض دل والے اپنی محبت کی خاطر تو تخت و تاج چھوڑ دیتے ہیں۔"

"جرمن محنت کش طبقے سے تعلق رکھتی ہو اور انگریز بادشاہ کے قصیدے گاتی ہو۔" جیوتی مصنوعی غصہ سے مارٹینا کی باہیں اپنے گلے سے نکال دیتا۔ "مارٹینا تم خود یہ ثابت کیوں نہیں کر دیتیں کہ تمہارے اس جوان، تندرست جرمن جسم میں ایک پیار بھرا دل دھڑکتا ہے۔ چھوڑو یہاں سب کچھ اور چلو میرے ساتھ ہندوستان۔ آؤ میں ابھی تمہاری ممی سے مل کر بات کر لیتا ہوں۔" جیوتی مارٹینا کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اس کے ساتھ مارٹینا کے گھر کی طرف قدم بڑھانے لگتا۔

"آدھی رات کو ملو گے تم میری ممی سے؟ — تم پاگل ہو جیوتی چیٹر جی۔ مار ڈالیں گی ممی۔ پہلے مجھے اور پھر تمہیں اور پھر آٹھ دس محبت میں گرفتار دوسرے نوجوانوں کو۔" مارٹینا ہمیشہ جیوتی اور اپنی ممی کی ملاقات ٹال جاتی۔

"تم غلط سلط باتیں نہ کیا کرو مارٹینا۔ اس وقت آدھی رات نہیں ہے، بلکہ گیارہ بج کر آٹھ منٹ ہوئے ہیں اور میں تم سے عاشقی میں وقت نہ گنواتا تو اس

وقت آرام سے بس سے ہوسٹل کے پھاٹک کے سامنے اتر رہا ہوتا۔ اور تمہاری ممی کو لوگوں کو قتل کرنے کا اگر اتنا ہی شوق ہے تو ان سے کہو کہ اس موذی بس ڈرائیور کو مار ڈالیں جو ایک منٹ دیر سے نہیں آتا اور جب آتا ہے تو آدھا منٹ نہیں رکتا کہ میں تم کو شب بخیر ہی کہہ سکوں۔" جیوتی کو مارٹینا سے چھیڑ چھاڑ کرنے میں بہت لطف آتا تھا اور وہ بھی ہنستے ہنستے سرخ ہو جاتی اور اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں خوشی کے پتلے پتلے آنسو تیرنے لگے اور جیوتی کو مارٹینا کی یہ بھیگی ہوئی، ہنستی ہوئی نیلی آنکھیں بہت پیاری لگتیں اور انہیں دیکھ کر جیوتی کو یقین ہو جاتا کہ اس کے اور مارٹینا کے بیچ جو رشتہ قائم ہو گیا تھا اس کا نام صرف محبت ہی ہو سکتا تھا اور اگر محبت کے لفظ پر مارٹینا کی ممی کو اعتراض ہو سکتا تھا تو وہ اپنے اس جذبہ کو عشق کہنے کے لیے بھی تیار تھا۔

مارٹینا کی آنکھوں کو آنسوؤں میں بھیگنے کا بہت تجربہ تھا، وہ خوشی میں روتی تھی، ناراض ہوتی تب روتی تھی، کسی مضمون میں کم نمبر آتے تو رونے لگتی، جیوتی کے علاوہ کوئی اور لڑکا اپنی دلچسپی کا اظہار کرتا تو مارٹینا کے آنسو رواں ہو جاتے، دو ایک دن جیوتی سے ملاقات نہ ہوتی تو آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی تھی۔ جیوتی نے مارٹینا کی آنکھوں کی نیلاہٹ میں برسات کا ہر روپ دیکھ لیا تھا مگر بوخن والڈ پہنچ کر جیوتی نے ان آنکھوں کا جو موڈ دیکھا تھا وہ آج بھی اسے اچھی طرح یاد تھا۔ یونیورسٹی کے لڑکے لڑکیوں کے ساتھ وہ دونوں بھی ویمر سے داخمار ہوتے بوخن والڈ کنسنٹریشن کیمپ دیکھنے کے لیے گئے تھے تو اس دن مارٹینا کچھ زیادہ ہی خاموش تھی۔ تمام راستے وہ کھڑکی سے باہر جھانکتی رہی تھی اور جیوتی نے محسوس کیا تھا جیسے مارٹینا کی چہرے کی سرخی غائب ہو گئی تھی اور جیوتی کو لگا تھا کہ وہ بار بار اپنے گھنے سنہرے بال اس

لیے اپنے چہرے پر جُھکا لیتی تھی کہ اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے جیوتی کو ڈبڈباتے ہوئے آنسو نظر نہ آجائیں اور جب وہ بوخن والڈ کیمپ کے سامنے مارٹینا کو بس سے اترنے میں مدد دے رہا تھا تو اس نے جیوتی کا ہاتھ اپنی پوری طاقت سے پکڑ لیا تھا جیسے اگر جیوتی کا سہارا نہ ملتا تو وہ زمین پر ڈھیر ہو جاتی۔ اٹھارہ سال گذر جانے کے بعد بھی مارٹینا کی گرفت جیوتی کو اچھی طرح یاد تھی۔

ایک بوڑھا گائیڈ ان لوگوں کو بوخن والڈ کنسنٹریشن کیمپ کی دردناک تاریخ سُنا رہا تھا کہ کس طرح ۱۹۳۷ء اور ۱۹۴۵ء کے درمیان سات برسوں میں ہٹلر اور اس کے فاشسٹ ساتھیوں نے اس کیمپ میں ۶۵ ہزار مردوں اور عورتوں اور بچوں کو طرح طرح کی ایذائیں دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ ان چند برسوں میں بوخن والڈ اور دوسرے کیمپوں میں دو کروڑ کے قریب معصوموں پر حد سے زیادہ مظالم ڈھائے گئے تھے جن کی تاب نہ کر ان میں سے آدھے مر گئے تھے، پھانسی پر لٹکا دیئے گئے تھے، جلا دیئے گئے تھے۔ انھیں اتنی تیز دوڑایا جاتا تھا کہ ان کا دم نکل جاتا تھا، ان پر اتنے کوڑے برسائے جاتے تھے کہ زمین ان کے خون سے سرخ ہو جاتی تھی، ان کے جسم سے چربی پگھلائی جاتی تھی، ان کی کھال اور ہڈیوں سے لیمپ بنائے جاتے تھے، ان کی کھوپڑیوں کو گرم پانی میں ڈال کر اُبالا جاتا تھا۔ جیوتی اپنے یونیورسٹی کے دوسرے لڑکے لڑکیوں کے ساتھ انسان کے انسان پر کیے گئے مظالم کے یہ ہولناک واقعات سنتا رہا اور کئی بار اس ظلم اور بربریت کے خلاف نفرت، تاسّف، غصہ اور غم کے ملے جلے جذبات سے مغلوب ہو کر خود اس کا جسم کانپ کانپ گیا۔ بہت سے نرم دل لڑکے اور لڑکیاں بلند آواز سے رونے لگے تھے۔ اور دل ہی دل میں سب سوچ رہے تھے کہ کاش اب جنگ کبھی نہ ہو، کاش اب جنگ کبھی نہ ہو، کاش

کسی بھی انسان پر یہ ظلم کبھی نہ ہوں۔

بوخن والڈ سے بے ناوالیس ہوتے ہوئے بس میں بے حد خاموشی تھی۔ نوجوان لڑکے لڑکیوں کے ہنسی مذاق بالکل ختم ہو چکے تھے۔ مارٹینا بس کی کھڑکی کے باہر پھیلی ہوئی سرسبز پہاڑیوں اور وادیوں کو دیکھتی رہی۔ گھاس جب ہری ہوتی ہے تو لوگ برفیلے موسم کا خیال دل میں نہیں لاتے مگر بوخن والڈ دیکھنے کے بعد سب لڑکے لڑکیوں کے لیے ماحول منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ اس سفر میں خود جیوتی بہت اداس تھا۔ اس لیے اور بھی کہ اب اس کے ہندوستان لوٹنے کا وقت آ گیا تھا اس کی پڑھائی مکمّل ہو چکی تھی۔ اسے جرمنی چھوڑنا تھا۔ چار برسوں میں جیوتی نے اس ملک کی زبان سیکھی تھی۔ موسیقی سنی تھی، یہاں کے نظاروں سے خوش ہوا تھا، یہاں دوست بنائے تھے اب ان سب کو شاید ہمیشہ کے لئے چھوڑنا ہوگا۔ جرمنی سے کس قدر خوشگوار یادیں وابستہ ہو گئی تھیں۔ اسے مارٹینا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہونا تھا۔ مارٹینا اس کی زندگی کا، اس کی شخصیت کا، اس کے سوچنے کے انداز کا ایک اہم حصّہ بن چکی تھی۔ مارٹینا ہیکز بر جو مارٹینا چیڑجی بننے کے لیے کسی طرح راضی نہ تھی اور نہ ہی اپنے انکار کی وجہ بتلانے کے لیے تیار تھی۔ مارٹینا جو اتنے قریب آنے کے بعد ایک معمّہ بن گئی تھی۔

اور آج اٹھارہ برس بعد وہ پھر بے نا میں تھا اور اُس کی محبوبہ مارٹینا اس کے ساتھ تھی۔ مارٹینا کے بال آج بھی سنہرے اور گھنے تھے مگر اب وہ اس کے رخسار پر جھولتے نہیں رہتے تھے۔ اس کی بڑی بڑی نیلی آنکھوں میں آج بھی خلوص کی چمک تھی مگر اب وہ زیادہ دیر تک جیوتی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے نہیں رہتی تھی۔ مارٹینا کا لانبا قد آج بھی جاذب نظر تھا مگر اب اس کے جسم میں گدازی بڑھ

گئی تھی۔ آج صبح بے نام سی سڑکوں پر وہ دونوں پھر سے ساتھ تھے اور بارش سے بھیگ رہے تھے مگر بارش سے زیادہ جیوتی پرانی یادوں سے شرابور تھا جن سے بچنے کے لیے مارٹینا کی چھتری تو کیا بڑے سے بڑا سائبان بھی کافی نہ ہوتا۔ جیوتی کو اچانک ایسا لگا۔ جیسے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی مارٹینا کی رفتار تیز ہو گئی اور وہ دو قدم اس سے آگے نکل گئی۔ جیوتی ماضی کے جھولوں میں جھولتے جھولتے ایک سیکنڈ میں بھاگتے دوڑتے حال میں آگیا تھا اور چاہتا تھا کہ ہاتھ بڑھا کر تیز چلتی ہوئی مارٹینا کو روک لے مگر دوسرے لمحے ہی جیوتی کو خیال آیا کہ اس کے اور مارٹینا کے درمیان دو قدم کا نہیں بلکہ اٹھارہ برس کا فاصلہ تھا اور اب اس کو یہ حق نہیں تھا کہ وہ مارٹینا کی کمر میں ہاتھ ڈال دے بلکہ اب پرانی دوستی کے ناتے اس کی ذمہ داری صرف اتنی رہ گئی تھی کہ وہ پھولدار چھتری اٹھائے مارٹینا کے ساتھ ساتھ اس طرح چلے کہ دونوں چھوٹی سی چھتری کی آڑ میں رہیں اور بھیگنے سے بچنے کی کوشش میں بھیگتے رہیں۔ جیوتی نے مارٹینا کے چہرے پر بھیگی بھیگی چمک کو دیکھ کر سوچا کہ یہ چمک خوشی کے آنسوؤں کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ بارش کی مہین پھوار کی وجہ سے تھی اور شاید مارٹینا کو بھی اتنے برس بعد جیوتی سے ملنے میں یہی احساس تھا۔ اسی لیے جیوتی کی کہنی پکڑ کر اپنے قریب کرتے کرتے اس نے اپنا ہاتھ فوراً ہٹا لیا تھا۔ ایک عورت اور ایک مرد جو برسوں پہلے عاشق اور معشوق رہ چکے ہوتے ہیں اکثر دوبارہ ملنے پر لمس کو گناہ سمجھنے لگتے ہیں، ایک دوسرے کو چھونے سے گریز کرتے ہیں کہ کہیں پرانے جذبات پھر سے نہ جاگ جائیں اور جذبات کی طغیانی موجودہ عمارتوں کو نہ بہالے جائے کیونکہ کبھی کبھی ان عمارتوں کی بنیاد ریت پر رکھی ہوتی ہے۔

"مارٹینا! اتنے برس بعد مجھے چند دن کے لیے جرمنی آنے کا موقع ملا تو میں

نے فوراً قبول کر لیا۔ صرف یہ سوچ کر کہ شاید تم سے ملاقات ہو جائے۔ میں تمہاری ممی سے تو ملاقات کرنا چاہتا ہوں یہ معلوم کرنے کے لیے کہ اٹھارہ برس پہلے وہ مجھ سے کیوں ملنا نہیں چاہتی تھیں مگر یاد رکھو نہ میں تمہارے شوہر سے ملنا چاہتا ہوں اور نہ ہی تمہارے بچّوں سے،“ جیوتی نے آگے بڑھ کر مارٹینا سے کہا۔ اس نے یہ جملے جوش و خروش میں کہے تھے اور شاید یہ جذبات کا زور تھا کہ جرمن زبان سے پرانی واقفیت مکمل طور پر لوٹ آئی تھی۔

”یہ تو اتفاق ہے کہ تمہارا خط مجھے مل گیا۔ وہ گلی جہاں سے تمہاری آخری بس نکل جایا کرتی تھی توڑ پھوڑ ڈالی گئی ہے اور اب وہاں بچوں کے لیے کھیلنے کے لیے ایک پارک بن گیا ہے۔ تمہیں یاد ہے نہ وہ جگہ جہاں رات کو بس آنے سے پہلے تم مجھ سے لپٹ جایا کرتے تھے،“ مارٹینا کی آواز میں پرانی شرارت تھی۔

”میں تم سے لپٹ جایا کرتا تھا؟ یہ خوب رہی! تمہیں یاد نہیں کہ ہمارے فزکس کے پروفیسر نے پڑھایا تھا کہ عمل اور ردّ عمل مساوی اور متضاد ہوتے ہیں“ جیوتی کو شلر یونیورسٹی کا خوبصورت لیکچر روم یاد آ گیا جہاں وہ اور مارٹینا قریب قریب بیٹھے لیکچر سنا کرتے تھے۔ ایک مہک نے اس کو آ کر گھیر لیا۔

”جیوتی میں بھی نہیں چاہتی کہ تم میرے گھر آؤ لیکن اتنا ضرور چاہتی ہوں کہ تم تھوڑا سا وقت میری ممی کے ساتھ گذارو تاکہ تمہیں اندازہ ہو سکے کہ وہ کیا بات تھی جس نے مجھے تمہارے بچّوں کی ماں نہیں بننے دیا۔ تمہارے بچّوں کی آنکھیں کالی اور چمکدار ہوں گی، ان کے بال سیاہ اور گھنے ہوں گے، ان کی رنگت دودھ میں گھلی ہوئی چاکلیٹ کی طرح دل کو لبھانے والی ہوگی،“ مارٹینا کی آواز سے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس نے گھنے سیاہ بالوں، کالی سیاہ آنکھوں والے سانولے سلونے

بچّوں کو بنا دیکھے ہی بہت بار گلے سے لگایا تھا، چاہا تھا، ان کے ملائم رخساروں پر اپنی ممتا کے پھول سجائے تھے۔

مارٹینا اور جیوتی فٹ پاتھ سے اتر کر ایک چھوٹے سے خوبصورت باغیچہ سے گذر کر ایک چار منزلہ عمارت کے ایک چوڑے دروازے میں سے اندر داخل ہو گئے۔ دروازہ کے لکڑی کے ہرے رنگ کے چوکھٹے میں بہت بڑی کانچ لگی ہوئی تھی جس کی صفائی سے اندازہ ہو گیا تھا کہ باقی بلڈنگ بھی کتنی صاف ستھری ہو گی۔

"ممی گراؤنڈ فلور پر رہتی ہیں"۔ مارٹینا کی آواز اتنی دھیمی تھی جیسے یہ بات اس نے خود اپنے سے کہی تھی اور پھر وہ اس کاریڈور میں جیوتی کے آگے آگے چلنے لگی جہاں دن کے وقت بھی بجلی کے بلب روشن تھے مارٹینا نے ایک دروازہ کے سامنے رک کر گھنٹی بجائی اور تھوڑی ہی دیر میں ایک اونچے قد کے دُبلے پتلے آدمی نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ اس کے سر کے سفید بال بہت کم ہو چکے تھے مگر مونچھیں گھنی تھیں۔ اس نے سلیٹی رنگ کے سوٹ کے اوپر نیلے رنگ کا ڈھیلا ڈھالا کوٹ پہن رکھا تھا۔ مارٹینا کے ساتھ ایک ہندوستانی کو دیکھ کر اس کو ذرا سا تعجب بھی نہ ہوا تھا۔

"گوتن مارگن ہر میکس اُلرِخت۔ آج میری ممی کی طبیعت کیسی ہے؟ میرے دوست، جیوتی، ان کی عیادت کے لیے آئے ہیں"۔ مارٹینا کے سوال پوچھنے کے انداز سے پتہ چل رہا تھا کہ مسٹر اُلرِخت بہت سنجیدہ بزرگ تھے اور سوائے کام کے ان سے اور کوئی بات نہیں کی جا سکتی تھی۔

"گوتن مارگن ہر جیٹر جی۔ آپ اندر آ جائیں"، مسٹر اُلرِخت نے دبی آواز میں کہا اور پھر مارٹینا سے مخاطب ہوتے ہوئے "فرولن ہیکتر! مجھے یہ رپورٹ دیتے ہوئے

بہت افسوس ہو رہا ہے کہ آپ کی ممی کی حالت میں ذرہ برابر بھی بہتری نہیں ہے لیکن سچ جانیے کچھ تشویش کی بات نہیں ہے۔ ان کے علاج معالجہ میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کی گئی ہے۔"

جیوتی مارٹینا کے پیچھے پیچھے کمرے میں آگیا۔ جیوتی کو جرمن زبان بولنے، پڑھنے لکھنے اور سمجھنے میں مہارت تھی۔ وہ جرمن لوگوں کی سنجیدہ مزاجی سے بھی واقف تھا اس لیے میکس البرخت کی باتیں سن کر جیوتی کو مارٹینا کی ممی کے بارے میں زیادہ فکر نہ ہوئی مگر جیسے ہی اس کی نظر اسپتالوں جیسے سفید اسٹیل کے اونچے پلنگ پر لیٹی ہوئی بوڑھی خاتون پر گئی اس کو یقین ہو گیا کہ مسٹر البرخت غلط نہ کہتے تھے۔ مارٹینا کی ممی کا جسم پاؤں سے کندھے تک سبز رنگ کے کمبل سے ڈھکا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے جسم میں ذرا سی جنبش بھی نہ تھی۔ یہ اندازہ کرنا بھی مشکل تھا کہ وہ سانس بھی لے رہی تھیں یا نہیں۔ ان کی نیلی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔

"میری بہت پیاری ممی گوتن مارگن۔ دیکھیے آپ سے ملنے آج میرے ساتھ جیوتی آیا ہے ممی۔ جیوتی اب کلکتہ میں رہتا ہے۔ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ، آپ کو یاد ہے نا ممی... ؟" مارٹینا کی آواز آہستہ آہستہ ہچکیوں میں بدلنے لگی لیکن اس کی ممی کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔ جیوتی نے ایک قدم آگے بڑھ کر ان کی کھلی ہوئی نیلی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ دونوں آنکھوں کو غور سے دیکھنے لگا اور ان میں چھپے جذبات کو پڑھنے کی کوشش کرنے لگا لیکن وہ آنکھیں بغیر جھپکائے خلا کو تکتے رہنے کی عادی ہو چکی تھیں۔ ان ٹھہری ہوئی پتلیوں میں کوئی جذبہ نہ تھا۔

"مارٹینا! ان کی یہ حالت کب سے ہے؟" جیوتی نے روتی ہوئی مارٹینا کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور مارٹینا کے چہرے سے نظریں ہٹا کر پلنگ کے

دوسری طرف، سرہانے کے قریب رکھی ہوئی چھوٹی میز پر ایک کٹ گلاس کے گلدان میں سجے ہوئے تازہ پھولوں کو دیکھنے لگا۔

"جن دنوں تم تعلیم ختم کر کے ہندوستان لوٹنے والے تھے، بس ان ہی دنوں سے۔ یاد ہے جب ہم یونیورسٹی کے لڑکے لڑکیوں کے ساتھ بوغن والڈ گئے تھے۔ دوسرے دن میں نے ممی سے کہا تھا کہ تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ وہ تمہیں جانتی تھیں جیوتی، میں ہر وقت تمہاری اتنی باتیں کیا کرتی تھی کہ جو مجھے جانتا تھا، وہ تمہیں جانتا تھا۔ ممی تم سے ڈرتی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ صرف تم میں اتنی صلاحیت تھی کہ ماں بیٹی کو جدا کر دو۔ میری بات سن کر وہ کہنے لگیں "تم اور جیوتی شادی کے بعد ہندوستان چلے جاؤ گے"، اور میں نے ہنس کر جواب دیا تھا، "ہاں ممی چلی جاؤں گی ہندوستان۔ کون سی لڑکی ہمیشہ اپنے ماں باپ کے گھر رہتی ہے۔ اور ممی میری یہ بات سن کر خاموش ہو گئیں اور پھر اپنے کمرے میں جا کر پلنگ پر لیٹ کر چھت کو گھورنے لگیں۔ حالانکہ ممی کو دن کے وقت آرام کرنا بالکل پسند نہیں تھا۔ بس اسی دوپہر سے ان کا یہی حال ہے، یونہی لیٹے لیٹے چھت کو تکا کرتی ہیں۔" مارٹینا پھر سے رونے لگی اور آج پھر جیوتی کو مارٹینا کی آنکھوں میں بھرے ہوئے آنسو تڑپانے لگے۔

"چلو مارٹینا، اس کمرے سے باہر چلو، ممی کے پلنگ کے قریب کھڑے رہنے سے کچھ نہ ہوگا۔ وہ تو شاید تمہارے بچوں کو تمہارے شوہر کو بھی نہ پہچانتی ہوں گی، میرا تعارف کرانے سے اب کیا حاصل ہوگا؟"، جیوتی نے کہا۔

"تم مجھ سے ناراض ہو کر ہندوستان لوٹ گئے تھے۔ اٹھارہ برس تک تم نے کوئی خط نہ لکھا۔ تمہارا پہلا خط چند دن پہلے ملا تھا۔ کہ تم ویانا آرہے ہو اور کسی

ہوٹل میں رُکو گے۔ شروع شروع میں تو میں اور سب ہی ڈاکٹر یہ سمجھے تھے کہ ممی کی حالت عارضی ہے علاج سے فائدہ ہوگا۔ میں نے سب کام چھوڑ کر تقریباً دو سال تک ممّی کی دن رات خدمت کی پھر ڈاکٹروں نے مجبور کیا کہ میں ان کو اس نرسنگ ہوم میں داخل کرادوں چونکہ ممّی احساس کی دہلیز کو پار کر کے کہیں دور چلی گئی تھیں۔ ان کو ہر وقت نرس اور ڈاکٹر کی دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔"

"تو مارٹینا۔ مجھ سے شادی کی انکار کی وجہ ممّی تھیں۔" کمرے کے باہر اندھیرے کاریڈور میں جیوتی نے رک کر مارٹینا سے پوچھا۔ جس سوال نے برسوں جیوتی کو پریشان رکھا تھا۔ اس کا حل اِس نرسنگ ہوم کے ایک اداس کمرے میں اسٹیل کے سفید پلنگ پر اٹھارہ سال سے لیٹا ہوا تھا۔

جیوتی اور مارٹینا باتیں کرتے ہوئے اب بلڈنگ کے باہر چھوٹے سے باغیچہ میں سے گذر رہے تھے۔ بارش تھم چکی تھی مگر ہوا میں سردی بڑھ گئی تھی۔ مارٹینا کی آنکھوں سے لگ رہا تھا جیسے وہ کسی پیچیدہ سوال کا حل ڈھونڈ رہی تھی، کوئی اہم فیصلہ کرنے والی تھی۔ "جیوتی جیسے ہی ہم باغیچہ کے باہر فٹ پاتھ پر پہنچیں گے میں بائیں طرف مڑکر اپنے گھر چلی جاؤں گی اور تم داہنی طرف مڑکر اپنے ہوٹل چلے جانا پلیز تم میری بات مان لو اور بحث نہ کرو۔"

"چار سال تک میں اس شہر میں رہا۔ تم سے محبّت، ہی نہیں عشق کرتا رہا۔ تمہاری ممی کے خلاف شکایتیں کرتا رہا مگر تم نے اپنی کہانی مجھے نہ سنائی۔ کیا تم مجھے بالکل نہیں چاہتی تھیں؟"

"حد سے زیادہ چاہتی تھی تمہیں۔" مارٹینا نے رُک کر جیوتی کی نظروں سے اپنی نظریں ملاتے ہوئے کہا۔ "مگر میں اپنی زندگی کے دُکھوں میں تم کو شامل نہیں

کرنا چاہتی تھی۔ میں جب تم سے ملی تھی تو بیس بائیس برس کی تھی اور مجھ کو اس
بات کا اعتراف کرتے شرم آتی تھی کہ میری اور میرے ماں باپ کی زندگی میں ہر
طرح کے مظالم کسی آسمانی مصیبت کی وجہ سے نہیں آئے تھے۔ ہماری زندگی
برباد کرنے والے کسی دوسری وحشی قوم کے لوگ نہیں بلکہ ہماری طرح جرمن تھے
ہٹلر اور اس کے درندے۔ میرے ماں باپ اور ان جیسے لاکھوں انسانوں کو اس
لئے کنسنٹریشن کیمپوں میں شدید ظلم سہنا پڑے تھے صرف اس لیے کہ انہوں
نے ہٹلر کے سیاسی فلسفہ کو ماننے سے انکار کر دیا تھا، صرف اس لیے کہ انہوں
نے حکومت کے اقتدار کے سامنے سر اٹھا کر چلنے کا فیصلہ کیا تھا۔" جیوتی نے
دیکھا کہ مارٹینا کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں ایک ایسی
نیلی چمک تھی جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ شاید جیوتی نے ہیروں کو تراشنے
کے بعد روشنی میں رکھا ہوا پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جیوتی نے سوچا کہ مارٹینا کو
ٹوکنا نہیں چاہیے چونکہ برسوں بعد اس کے جذبات کا دریا سیلاب بن چکا
تھا۔ "تم سے جو میں نے بات ہمیشہ چھپائی تھی جیوتی وہ یہ تھی کہ میرا بچپن بوخن
والڈ کنسنٹریشن کیمپ میں گذرا تھا جہاں میرے ماں باپ اور بڑے بھائی قید
تھے۔ مجھے ممی نے بعد میں بتلایا تھا کہ مجھ کو اور میرے بھائی کو تقریباً دو ہزار دوسرے
بچوں کے ساتھ گھوڑوں کے ایک چھوٹے سے اصطبل میں قید کیا گیا تھا۔ اس
اصطبل میں کھڑکیاں نہیں تھیں، تازہ ہوا نہیں تھی، وہاں امونیا کی سڑانڈ ہوتی تھی،
بھوک پیاس ہوتی تھی، چار پانچ بچوں کے لیے ایک پھٹا ہوا کمبل ہوتا تھا۔ قید کے
پہلے سال ہی میں آدھے سے زیادہ بچے مر گئے تھے، بیماری، گندگی اور بھوک سے۔
مرنے والوں میں میرا بھائی بھی تھا۔ میں شاید اس لیے زندہ رہ گئی تھی کہ ممی دن بھر کے

اپنے راشن میں سے بچا بچا کر مجھے کھلایا کرتی تھیں ۔ ان بے چاری کو چار پانچ ڈسٹ سے زیادہ دن بھر میں روٹی نہیں ملتی تھی ۔ وہ جب مجھ سے ملنے آتیں تو پہریدار انہیں کوڑوں سے مارتے تھے ، اپنے فوجی جوتوں سے انہیں ٹھوکریں لگاتے تھے مگر انہیں میری فکر رہتی تھی ۔ تمہیں بوخن والڈ ہے نا جیوتی ؟ ،،

”ہاں مارٹینا ۔ اتنا عرصہ گذر جانے کے بعد بھی وہ ہولناک جگہ بھی مجھے یاد ہے ۔ تمہارے والد کا کیا ہوا ؟ ،،

” میرے ڈیڈی جنگ سے پہلے ہائیڈل برگ ۔ یونیورسٹی میں فلسفہ پڑھاتے تھے ، انہیں وائلن بجانے میں سنا ہے بڑی مہارت تھی ۔ بوخن والڈ کیمپ میں لوہے کے بڑے پھاٹک سے داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ کو کھلا ہوا میدان ہے ۔ یہ سمجھو پھاٹک اور اُن گیس چیمبرز کے درمیان جہاں بے کفن لاشیں جلائی جاتی تھیں ۔ اس میدان میں ان فاشسٹ درندوں نے میرے ڈیڈی کو بائیس مردوں کے ساتھ کھلے آسمان کے نیچے ایک پنجرہ میں بند کر دیا تھا ۔ کہتے ہیں ہٹلر انسانی جسم کی قوّتِ برداشت کا اندازہ لگانا چاہتا تھا ۔ میرے ڈیڈی شدید سردی میں دن رات بھوکے پیاسے برف سے زیادہ ٹھنڈی برسات میں اس تجربہ کا نشانہ بنے رہے ، سِسک سِسک کر مرتے رہے ۔ میری ممّی کو ہر روز یہ منظر دیکھنے کے لیے اس پنجرہ کے پاس سے گذرنا پڑتا تھا جہاں پہریدار اپنے موٹے تازے کتّوں کو کھانا کھلاتے تھے ۔،،

مارٹینا نہ جانے کتنی بار یہ سب یاد کر کے رو چکی ہو گی مگر ایسے مظالم کی یاد بار بار اس کی آنکھوں کو آنسوؤں سے بھرتی رہی ہے رُلاتی رہی ہے ۔

”مارٹینا ، میں تمہیں چپ کراؤں تو کس طرح ؟“ جیوتی کو صبر کی تلقین کے لیے الفاظ نہیں مل رہے تھے ، وہ خود کو بہت لاچار اور کمزور محسوس کر رہا تھا ۔

"میری ممی نے بوخن والڈ میں اتنا کچھ دیکھ لیا تھا۔ ہوتی کہ آج ان کو کچھ اور دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں رہی ہے، وہ تم کو نہیں دیکھ سکتیں جیوتی، وہ مجھ کو نہیں دیکھ سکتیں!" مارٹینا نے اپنے پرس سے چھوٹا سا رومال نکالا اور آنسو خشک کرنے لگی۔

"اور میرے اصرار پر تم نے جب اپنی ممی سے مجھ سے شادی کر کے ہندوستان جانے کی بات کی ہوگی تو بڑھاپے میں تنہائی کے خیال نے بوخن والڈ کے ہر ظلم کی یاد تازہ کردی ہوگی۔"

"میں اپنے گھر جا رہی ہوں جیوتی۔ مگر میری دو درخواستیں ہیں۔ تم سے پرانی دوستی کے رشتہ سے۔ ایک تو یہ کہ تم مجھے بے وفا نہ سمجھنا اور دوسرے یہ کہ آئندہ مجھ سے ملنا نہیں۔ رحم کا زہریلا سانپ ہر رشتہ کو ڈس لیتا ہے۔" مارٹینا یہ کہہ کر جلدی جلدی باغیچہ کے گیٹ سے نکل کر فٹ پاتھ پر بائیں طرف مڑ گئی اور اس کو جاتے ہوئے دیکھ کر جیوتی سوچنے لگا کہ مارٹینا سے اس کا عشق ناکام نہیں ہوا تھا۔ اِن دونوں کی جُدائی کے پیچھے وہ ہولناک مظالم تھے جن کی قاتل پرچھائیوں نے مارٹینا کی ممی کی آنکھوں کو بے احساس، بے رنگ اور بے نور بنا دیا تھا، پتھرا دیا تھا۔ جیوتی خود بھی باغیچہ سے باہر نکلنے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اس نے مسٹر میکس آلرخت کو بلڈنگ کے اس کانچ کے صاف شفاف دروازے سے نکلتے دیکھا جو ہرے رنگ کی لکڑی کے چوکھٹے میں لگا ہوا تھا۔ جب وہ جیوتی کے قریب سے گذرنے لگے تو جیوتی بھی ان کے ساتھ چلنے لگا اور چونکہ وہ فٹ پاتھ پر آکر داہنی طرف مڑ گئے تھے، وہ ان سے باتیں کرنے لگا۔

"مسٹر آلرخت۔ کیا مسز ہیکرنیکر کی حالت کبھی بہتر ہوگی؟"

"نہیں ہر چیبڑ جی۔ اچھے سے اچھے ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ مسز ہیکنز مر اب کبھی نارمل نہ ہو سکیں گی۔ کسی دن اسی سکتہ کے عالم میں ان کی موت واقع ہو جائے گی۔ یہ آج شام یا کل صبح بھی ہو سکتی ہے اور دس سال بعد بھی۔"

"مسٹر اُلرخت۔ آپ کو میرا نام کس نے بتلایا؟" جیونتی نے ان سے پوچھا

"مسٹر جیونتی چیبڑ جی۔ روز ہی فرولین مارٹینا ہیکنز مر اپنی ممی کی عیادت کو آتی ہیں اور ان سے آپ کی باتیں کرتی ہیں۔ میں پچھلے بارہ برس سے اس نرسنگ ہوم میں کام کر رہا ہوں۔ بھلا آپ کا نام کیسے بھول سکتا ہوں؟" میکس اُلرخت نے چلتے چلتے رک کر کہا۔ ان کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ ان کی منزل آ گئی تھی اور وہ گفتگو ختم کرنے کا مناسب بہانہ ڈھونڈ رہے تھے۔

"بس ایک معمہ اور حل کر دیجئے۔ آپ مارٹینا کو فرولین ہیکنز مر کہہ کر مخاطب کرتے ہیں، اس کے شوہر کے نام سے نہیں پکارتے؟" جیونتی نے مسٹر اُلرخت سے پوچھا۔

جہاں تک مجھے علم ہے، ہر چیبڑجی! فرولین مارٹینا ہیکنز مر نے کبھی شادی نہیں کی۔ وہ محبت کے لیے ایثار کرنے والوں میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ ان کی قربانی بے مثال ہے۔ اچھا اب مجھے اجازت دیجئے۔ میری بیوی میرا انتظار کر رہی ہو گی، گڈ بائی۔"

"گڈ بائی۔" جیونتی نے جواب دیا اور آہستہ آہستہ اپنے ہوٹل کی طرف بڑھنے لگا۔ شاید اس کو دوبارہ جرمنی میں نہیں آنا چاہیئے تھا۔ دوپہر شروع ہو جانے کے بعد صبح سے دوستی قائم رکھنے میں صرف ناکامی یا الجھن ہی ہو سکتی ہے۔

زندگی شطرنج کی بساط کی طرح منظم نہیں کہ ایک ہی سائز کے سفید اور کالے چوکور خانے ایک دوسرے کے سہارے جمے رہیں جیسے یہ شاعرانہ توازن برقرار رکھنے میں ان کا آپسی معاہدہ ہو۔ زندگی البتہ شطرنج کی بازی کی طرح ضرور ہو سکتی ہے۔

فتح اور شکست، اچھائی اور برائی امید اور نا امیدی کے درمیان معلّق۔ زندگی میں یہ اکثر ہوتا ہے کہ مکمل طور پر اجنبی لوگ دل کے بہت قریب آجاتے ہیں، اور قریب رہنے والے بہت دُور چلے جاتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ برسوں پہلے گذرے ہوئے واقعات ایک نئی سج دھج سے سامنے آتے ہیں اور آج ہونے والی باتیں بالکل بے معنی سی لگتی ہیں۔ میں ایسی باتیں کبھی نہیں سوچتا تھا۔ میری زندگی پہلی برسات میں سوکھی ہوئی زمین سے اٹھنے والی سوندھی خوشبو کی طرح لاابالی تھی مگر تجربات انسان کو بدل دیتے ہیں۔ بعض وقت صرف ایک تجربہ بھی انسان کو بہت کچھ سکھا دیتا ہے۔ ایسے ہی ایک تجربے نے تین بہ ظاہر غیر متعلق لوگوں کو ایک

قریبی رشتے میں باندھ دیا ہے۔ میں دلی میں رہوں یہیں میرا کاروبار ہے۔ میں نے کل دلی کے ایک جرنلسٹ 'ویر سہگل' کے بارے میں خبر پڑھی اور یہ خبر پڑھتے ہی مجھے لگا کہ لندن کے روڈنی نورٹن، امروہے کے شبیہ احمد اور دلی کے ویر سہگل ایک عجیب و غریب کہانی کے کردار ہیں۔

میرا نام شبیہ احمد ہے اور امروہہ میرا آبائی وطن ہے۔ دلی میں میرے والد کا ٹرنک بنانے کا ایک بڑا کارخانہ ہے۔ ہمارے بنائے ہوئے مضبوط اور خوبصورت ٹرنک ہندوستان کے ہر شہر میں بکتے ہیں۔ یہ کارخانہ لگائے ہوئے میرے والد کو کافی عرصہ گزر گیا مگر سنتے ہیں کہ ہمارے کاروبار کو ترقی اس زمانے سے ہوئی جب ملک تقسیم ہوا تھا۔ چند مہینے پہلے جب لندن میں روڈنی نورٹن کو میں نے اپنی بزنس کے بارے میں بتلایا تھا تو انھوں نے کہا تھا کہ شاید مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ ہمارے کارخانے کے بنائے ہوئے ٹرنک ہندوستان کے علاوہ پاکستان کے شہروں میں بھی موجود تھے۔ بعد میں میں نے روڈنی نورٹن صاحب کی اس بات کے بارے میں بہت غور کیا۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہتے تھے۔

کچھ مہینے پہلے میں نے باہر کے کئی ملکوں کا دورہ اس خیال سے کیا تھا کہ یہ اندازہ کرسکوں کہ کہاں کہاں ہمارے ٹرنک بھیجے جاسکتے ہیں۔ کاروبار میں جب انسان ایک بار پیسہ بنانے کا گر سیکھ جاتا ہے تو وہ اور زیادہ پیسہ بنانا چاہتا ہے۔ دولت سے پیدا ہونے والی دولت بہت تیزی سے بڑھتی رہتی ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ لندن پہنچ کر اپنا دورہ ختم کردوں گا۔ فرانس سے میں برطانیہ پانی کے جہاز کے ذریعہ سے پہنچا اور پھر ڈوور سے لندن تک ٹرین

میں سفر کیا۔ اپنا کالے چمڑے کا چمکتا ہوا سوٹ کیس اٹھائے ہوئے جب میں ٹرین کے ایک ڈبے میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ بڑے بڑے پھولوں والے کپڑے سے بنی ہوئی آرام دہ سیٹ پر ایک شخص وہاں پہلے ہی سے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے سوٹ کیس اس چھوٹی سی میز کے نیچے رکھ دیا جو شاید چائے اور کافی کی پیالیاں رکھنے کے لیے استعمال ہوتی ہوگی۔ گارڈ کی سیٹی کی آواز کے ساتھ ٹرین ایک جھٹکے سے روانہ ہوگئی۔ میں اس بڑی کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا جو میری اور اس شخص کی سیٹوں کے بیچ میں لگی ہوئی تھی۔ وہ موسم گرما کے آخری زمانے کا ایک چمکدار دن تھا۔ نیلے آسمان کے نیچے ہر طرف ہلکی ہلکی دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور اس نکھری ہوئی دھوپ میں سرسبز وادیاں ہری ہری پہاڑیاں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ فرانس کی بھوری اور سپاٹ سرزمین دیکھنے کے بعد یہ منظر مجھے بہت فرحت بخش معلوم ہو رہا تھا۔ افق کے قریب لانبے لانبے درختوں کی قطاریں جیسے نیلگوں دھوئیں میں چھپنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ہلکا ہلکا شور مچاتی ہوئی ٹرین جب کسی چھوٹے سے دریا پر سے گذرتی تو چمکدار پانی میں کنارے پر کھڑے ہوئے پودوں اور ان کی نازک ٹہنیوں پر لگے ہوئے خودرو رنگین پھولوں کا عکس نظر آتا۔ قدرت کا یہ بے پناہ حسن دیکھ کر میں بے حد مسرور تھا۔

"کیوں صاحب" میں نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے ہمسفر سے پوچھا "کیا یہ ٹرین واٹرلو کے اسٹیشن پر رکے گی۔؟"

"ہاں رکے گی" انھوں نے کتاب سے اپنی نظریں اٹھا کر مجھے دیکھتے ہوئے کہا "کیوں کیا تمہیں واٹرلو پر اترنا ہے۔؟"

"جی نہیں، اترنا تو چیرنگ کراس پر ہے مگر واٹرلو دیکھنا چاہتا ہوں۔ مشہور مقام ہے۔

ابھی فرانس میں رہ کر آرہا ہوں نا ـــــــــــ نپولین کو چاہنے والے واٹر لو کا نام لے کر خوش نہیں تھے۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ وہ واٹر لو نہیں ہے جہاں کوئی ڈیڑھ سو برس پہلے ڈیوک آف ویلنگٹن نے نپولین کو شکست دی تھی۔ وہ تو بیلجیم میں برسلز کے قریب ایک چھوٹا سا مقام ہے" انھوں نے کچھ اس طرح کہا جیسے یوروپ کی تاریخ سے عدم واقفیت کی انھیں مجھ سے توقع تھی۔

"اوہ مجھے معلوم نہیں تھا" میں نے کہا۔

"ہر ملک میں بہت سارے مقامات صرف اس لیے مشہور ہو جاتے ہیں کہ وہاں پر تاریخ کے کسی نہ کسی عہد میں چند سو یا چند ہزار انسانوں نے ایک دوسرے کی جان لی تھی" انھوں نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ ان کی بڑی آنکھوں کو ایک عجیب سے جذبے نے شاید اور زیادہ گہرا نیلا کر دیا تھا۔ ان کی آواز میں جو ایک کرب تھا وہ ٹرین کے پہیوں کی مسلسل گھڑگھڑاہٹ کے باوجود سنا جا سکتا تھا۔

"اتنی دیر سے آپ مجھ سے اردو زبان میں باتیں کر رہے ہیں۔ ہماری زبان آپ نے کہاں سیکھی؟" میں نے ان سے پوچھا۔

"تمھارے ملک میں۔ میرا نام روڈنی نورٹن ہے۔ تمھارا کیا نام ہے؟" انھوں نے سوال کیا۔

"جی۔ شبیہ احمد" میں نے انھیں بتلایا۔

"پاکستان کے رہنے والے ہو؟" انھوں نے پوچھا۔

"جی نہیں ـــــــ میں تو امروہے کا رہنے والا ہوں۔ ہندوستان میں ایک شہر ہے۔ شاعروں اور آموں کی وجہ سے مشہور ہے۔" یہ جواب دیتے وقت میں نے سوچ لیا

تھا کہ ہندوستان واپس جا کر معلوم کرونگا کہ کہیں میرا آبائی وطن کسی قتلِ عام کی وجہ سے تو مشہور نہیں ہوا تھا۔

"ہندوستان کی تقسیم سے دس برس پہلے میں لاہور میں پیدا ہوا تھا۔ میرے ماں باپ وہاں ایک اسکول میں پڑھاتے تھے۔" روڈنی نورٹن صاحب نے کہا۔

"اور میں ہندوستان کی تقسیم کے ٹھیک دس سال بعد ہندوستان میں پیدا ہوا تھا۔" میں نے کچھ اس طرح مسکراتے ہوئے کہا جیسے اپنے ملک کی تاریخ کے اس دور سے میرا کوئی رشتہ یا واسطہ نہ تھا۔

"تقسیم کے زمانے کے فسادات کو تم نے نہیں دیکھا جب ہی تو تمھارے مزاج میں شوخی بھری ہوئی ہے۔" روڈنی نورٹن کے جواب سے لگا کہ انھیں میری خوش مزاجی پسند نہیں آئی تھی۔

"میری عمر میں نورٹن صاحب آپ بھی میری ہی طرح رہے ہونگے۔" میں نے جواب دیا اور ان کے بردبار چہرے سے نظریں ہٹا کر چلتی ہوئی ٹرین سے باہر دیکھنے لگا۔ اب ہلکے ہلکے بادلوں کی وجہ سے آسمان کی نیلاہٹ جیسے جگہ جگہ سے ٹوٹ گئی تھی مگر دور کھیتوں میں دھوپ کچھ اس طرح پھیلی ہوئی تھی جیسے وہ کھیت نہ ہوں چمکتے ہوئے پانی سے بھرے ہوئے تالاب ہوں۔

"نہیں، تمھاری عمر میں بھی میں بے حد سنجیدہ تھا۔" روڈنی نورٹن کی گہری نیلی آنکھیں اب مجھے بہت غور سے دیکھ رہی تھیں مگر ان کے دیکھنے کا انداز اجنبیوں جیسا نہیں تھا۔ نہ ہی ان کی آواز میں کسی قسم کی غیریت تھی۔ ایک درد بھری مسکراہٹ ان کے پتلے ہونٹوں پر کھیل گئی اور ان کی آنکھیں جیسے نمناک سی ہو گئیں۔ اپنے سفید ہوتے ہوئے سنہری بالوں پر انھوں نے

ہاتھ پھیرا اور کہنے لگے "میں دس برس کی عمر میں بھی سنجیدہ تھا۔ کیا تم میری کہانی سنو گے؟ ابھی واٹرلو آنے میں بہت دیر ہے۔"

"آپ اپنی کہانی سنائیے۔ مجھے اب واٹرلو سے کوئی دلچسپی نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"واٹرلو کا پل بہت خوبصورت ہے۔ اس کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جب ہٹلر کے بم لندن پر برس رہے تھے ہمارے ملک والوں نے اس پل کی تعمیر کی تھی۔ میں ۱۹۴۷ء سے دس سال پہلے پیدا ہوا تھا اور تم دس سال بعد۔ تاریخ کے اس اہم واقع سے میری اور تمہاری پیدائش یکساں دوری پر ہے مگر مجھے اس دور کا ذاتی تجربہ ہے اور تمہیں نہیں شاید اسی وجہ سے ہماری شخصیتیں الگ الگ ہیں ویسے ہماری عمروں میں بھی فرق ہے جیسا تم نے کہا۔ روڈنی نورٹن نے کتاب کو اپنی سیٹ کے قریب چھوٹی سی میز پر رکھدیا تھا۔

"اور ایک فرق یہ بھی تو ہے کہ آپ انگریز ہیں اور میں ہندوستانی۔" میں نے کہا۔

"ہاں شاید یہ فرق بھی ہے مگر تمہاری عمر کے انگریز لڑکے لڑکیاں انگلستان کی تاریخ سے واقف نہیں۔ تمہاری عمر کے جرمن لڑکے اور لڑکیوں کو یہ نہیں معلوم کہ ان ہی کے ملک میں ہٹلر نے کسی وحشیانہ طریقے سے معصوم یہودیوں کی جانیں لی تھیں۔ اگر تم لوگ گذرے ہوئے زمانے سے بے بہرہ رہو گے تو کیا تم سمجھتے ہو کہ تاریخ خود کو دہرائے گی نہیں۔ تاریخ سے ہم سب کو کم از کم یہ تو سیکھنا چاہئے کہ اچھے خاصے نارمل انسان حیوانوں کی طرح ایک دوسرے پر ظلم ڈھا سکتے ہیں۔ اس حیوانیت کو روکنے کی تدبیر بھی سوچنی چاہیے۔

میں ۱۹۴۷ء میں دس برس کا تھا۔ اگر دو برس کا بھی ہوتا تو وہ واقعات مجھے ساری زندگی یاد رہتے۔ ان دنوں میرے ہاتھ پاؤں مردوں جیسے تھے مگر ان کا سائز ذرا چھوٹا تھا۔ میرے سوچنے کا انداز بھی بڑوں جیسا تھا مگر میرا تجربہ ذرا کم تھا۔ یہ احساس مجھ کو کئی برس بعد ہوا

تھا کہ میرا تجربہ کم تھا ورنہ ان دنوں میں خود کو بہت لائق سمجھتا تھا۔ مجھے پنجاب کے بھرپور دریاؤں کا چمکتا ہوا شفاف پانی بہت پسند تھا۔ میں اپنے ماں باپ سے اجازت لے کر گھنٹوں راوی کے کنارے بہتے ہوئے پانی کو دیکھتا رہتا۔ تیزی سے بہتے ہوئے دریا ہمیں سفر کی ترغیب دیتے ہیں۔ وہ ہم سے کہتے ہیں چلتے رہو، رکو نہیں ——— مگر اب مجھے ایک ہی جگہ رکے کتنے برس ہو گئے ہیں۔ سب کچھ جیسے مجھے پیچھے چھوڑ کر آگے نکل گیا ہے۔ یہ شاید اس لیے ہوا کہ میرا رشتہ ان دریاؤں سے ٹوٹ گیا جو لڑکپن میں مجھے دوسرے بھائی بہن نہ ہونے کی کمی پوری کر دیا کرتے تھے۔ ہم اور تم ٹرین کے اس ڈبے میں ساکت بیٹھے ہیں مگر یہ ٹرین تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی ہے ——— ڈوور کی سفید چٹانوں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی وادیوں اور جنگلوں کے بیچ میں سے دوڑتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے مگر ڈوور کی اونچی چٹانیں سمندر کے کناروں پر آہستہ آہستہ کٹتی جا رہی ہیں۔ زندگی کی اصلی دوڑ میں ہمیں خود آگے بڑھنا پڑتا ہے ورنہ وقت کا بے رحم پانی ہمیں ریزہ ریزہ کر دیتا ہے۔ ہم کو دراصل کسی نہ کسی چیز پر عقیدہ رکھنا چاہیے چاہے یہ عقیدہ دریا کے تیزی سے بہتے ہوئے پانی کے اوپر اڑتے ہوئے لطیف بادلوں کے بھاگتے ہوئے سائے پر ہی کیوں نہ ہو۔ میں جب نو برس یا دس برس کا تھا اور لاہور کے طلسم ربا شہر میں رہتا تھا تو مجھے خوبصورت پریوں اور مہربان فرشتوں کے وجود پر یقین تھا۔ میرے ماں باپ اور دوسرے بزرگ میری باتیں سن کر ہنس پڑتے تھے۔ ان کے اس ہنسنے پر میں بہت کھسیا جاتا اور ایسے موقع کی تلاش میں رہتا کہ کوئی بہت ہی مشکل کام ان پریوں اور فرشتوں کی مدد سے کرواؤں تاکہ میرے عقیدے پر ہنسنے والے بھی ان آسمانی ہستیوں پر یقین کرنے لگیں جو بادلوں کی طرح ہر طرف سفید جھنڈے لہراتے اڑتے رہتے ہیں۔ ہمارے قریب مگر عام آدمیوں کی آنکھوں سے

ادجھل۔ فرشتوں سے بہت سے لوگ ملتے ہیں مگر انھیں پہچاننا چند خوش قسمت انسانوں کے حصہ میں آتا ہے۔

ہندوستان کی تقسیم کے دوران مجھے، روڈنی نورٹن کو، ان فرشتوں سے ملنے کا موقع ملا۔ پنجاب کے بعض علاقوں میں ہندو مسلمانوں اور سکھوں میں جھڑپیں تو جون جولائی میں شروع ہو گئی تھیں مگر اس وقت کے انگریز ویسرائے نے سرحد کا فیصلہ اگست تک نہیں کیا تھا یا شاید ماونٹ بیٹن نے فیصلہ کر لیا تھا مگر اعلان نہیں کیا تھا۔ لاہور کی آبادی آدھی مسلمان تھی اور آدھی ہندو اور سکھ۔ مسلمان سوچتے تھے کہ مغل بادشاہوں کا لاڈلا لاہور پاکستان کے حصّہ میں آئے گا۔ باقی لوگ سوچتے تھے کہ یہ سرزمین ہندوستان میں رہے گی۔ میں محلہ کے سکھ، ہندو اور مسلمان لڑکوں کی طرح ایک گورنمنٹ اسکول میں پڑھتا تھا۔ میرے ماں باپ کے انگریز دوستوں کو اعتراض تھا کہ میں ایک عام اسکول میں کیوں پڑھتا تھا۔ اردو زبان کیوں سیکھتا تھا مگر اپنے خیالات کے اعتبار سے میرے ماں باپ انگریز نہیں تھے۔ وہ گاندھی جی کو مہاتما مانتے تھے اور ان کے عدم تشدد کے فلسفے کے پرستار تھے۔ جب میرے ماں باپ کے انگریز دوست جو فوج میں تھے کسی جھگڑے یا فساد کی خبر ہمارے گھر لاتے تو میری ماں کہتیں کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ایک دن میں اسکول گیا تو پتہ بھی نہ تھا کہ لوٹونگا تو میرا پورا محلہ جل رہا ہو گا۔ وہ لوگ جو کئی کئی پشتوں سے ایک دوسرے کے بھائی بن کر رہتے آئے تھے اچانک ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے تھے۔ کیا کبھی کسی نے یہ سنا ہے کہ جڑواں بچوں نے ماں کے پیٹ میں ایک دوسرے کو ہلاک کر دیا ہو۔ اس سہ پہر میں جب اسکول سے لوٹا تو بس لوگ ایک دوسرے کو قتل کر رہے تھے، گھروں کو جلا رہے تھے، بچوں کی لاشیں ہوا میں اچھالی جا رہی تھیں۔ ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں کا خون

ایک رنگ کا تھا ــــــــــ سرخ اور یہ سرخ خون سڑکوں پر بہہ رہا تھا۔ میں نے اسکول سے واپس آکر یہ سب کچھ دیکھا اور بھاگ کھڑا ہوا ــــــــــ پتہ نہیں مجھے کسی نے کیوں نہیں مار ڈالا۔ شاید میرے سنہری بال، سہمی ہوئی نیلی آنکھیں اور خوف سے زرد گوری رنگت نے چاقوؤں، کلہاڑیوں اور کرپانوں کی بوچھار میں مجھے خشک رکھا۔ میں بھاگتا رہا، بھاگتا رہا یہاں تک کہ آبادی سے باہر آگیا۔ جلتے ہوئے گھروں کا دھواں، عورتوں اور بچوں کے رونے کی آوازیں، حملہ آوروں کے نعروں کی دل ہلا دینے والی گونج ــــــــــ سب پیچھے رہ گئے تھے۔ میری سانس پھول گئی تھی، میرا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا کہ میں اس کی آواز سن سکتا تھا۔ آج تیس برس گذر جانے کے بعد بھی وہ آواز ذہن پر ہتھوڑے برساتی ہے۔ بھاگتے بھاگتے میں سوکھے ہوئے کھیتوں کے پاس ایک کچی سڑک پر مڑ گیا۔ فصلیں بونے والے کسان ایک عجیب و غریب فصل کاٹنے میں مشغول تھے ــــــــــ کھیتوں سے دور آبادیوں میں۔ اچانک میں نے اپنے پیچھے سے آتی ہوئی ایک کار کے انجن کی آواز سنی۔ میں نے بھاگتے ہوئے گردن گھما کر دیکھا۔ وہ کالے رنگ کی ایک بڑی سی کار تھی۔ کسی نے میرے دھڑکتے ہوئے دل میں چپکے سے کہا "یہی وہ فرشتے ہیں روڈنی جن سے ملنے کا تمھیں اتنا اشتیاق تھا۔ یہ تمھاری مدد کریں گے۔" یہ اندرونی آواز سن کر میں فوراً رک گیا۔ کار میرے قریب سے گذر گئی اور پھر تھوڑی دور جا کر رک گئی کچی سڑک پر چار پہیے اچانک رک جانے سے دھول کا ایک غبار سا اٹھا اور اس غبار کو ہاتھوں سے ہٹاتے ہوئے ایک لڑکی میرے قریب آئی اور پوچھنے لگی "تم ہمیں دیکھ کر ڈر تو نہیں گئے تھے"۔ اور میں نے جواب دیا کہ "نہیں"۔ اور میں واقعی ڈرا نہیں تھا۔ یہ بات مجھے کئی برس گذر جانے کے بعد معلوم ہوئی کہ اپنے خوف کے اعتراف کے لیے بہت ہمت درکار ہوتی ہے۔ وہ لڑکی جو

کار سے اتر کر میرے قریب آئی تھی پریوں کی طرح حسین تھی۔ اس کا قد لانبا تھا اور رنگ پنجاب کے گیہوں کی طرح خوبصورت اس کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں اور بال سیاہ ریشمی دھاگوں کی طرح چمکدار۔ میرے انگریز دماغ میں اس شام سے پہلے کبھی یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ پری شلوار قمیض اور دوپٹہ پہنے بھی ہو سکتی ہے۔ "آپ پری ہیں نا؟" میں نے ہانپتے ہانپتے اس لڑکی سے پوچھا اور وہ بے ساختہ ہنس پڑی تھی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنی کار تک لے گئی اور اس میں بیٹھے نوجوان سے مخاطب ہوئی۔ "ڈیر یہ بیچارہ نہ جانے کب سے بھاگتا چھپتا پھر رہا ہے۔ پسینہ میں بھیگ گیا ہے۔ گرد میں اٹا ہوا ہے۔ کیا ہم اسے اپنی کار میں بٹھا لیں؟" اور اس نوجوان نے جواب دیا "ہاں ہاں ضرور نسیمہ۔ میں کار سے صرف اس خیال سے نہیں اترا کہ اس کا نازک دل ایک لمبے چوڑے مرد کو اپنی طرف آتا دیکھ کر اور سہم جائے گا۔" اس نوجوان نے مڑ کر کار کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔ بیٹھتے وقت میں نے اسے غور سے دیکھا ـــــــ گھنے کالے بال، جاگی ہوئی غلافی آنکھیں، نہایت رحمدل دہانہ اور کشمیریوں جیسا رنگ۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ایک فرشتہ تھا جو میری جان بچانے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ وہ پری کار چلانے لگی۔ ہم تینوں کافی دیر خاموش رہے کچی سڑک پر کار کافی اچھل رہی تھی۔ کچھ تو راستہ ناہموار تھا اور کچھ کار کی رفتار تیز تھی مگر میں سوچ رہا تھا کہ اپنے ماں باپ کو ان دونوں کے بارے میں تفصیل سے بتلاؤں گا کہ فرشتے اور پری ایک دس برس کے لڑکے کے دماغ کی تخلیق نہیں ہوتے۔ اپنی بات کو سچ ثابت کرنے کے خیال سے ہی میں بہت دیر مگن اور مسرور رہا پھر میں ان دونوں کی باتیں سننے لگا۔

"ڈیر میں تمھیں ہندوستان کی سرحد پہ پہنچا کر لوٹ آؤنگی۔ میرے امی جان ابا جان اس وقت کتنے پریشان ہو رہے ہونگے۔"

"میں تمھیں ان حالات میں اکیلے ہرگز واپس نہ جانے دونگا۔ نسیمہ کار پلٹا لو۔ میں تمھیں تمھارے گھر چھوڑ آؤنگا۔ تم یہاں تک آئیں کیوں؟"

"تمھیں بچانے کے لیے ویر، وہ لوگ تمھیں مار ڈالتے۔"

"مر جانے دیتیں۔ ہمارے اس مہذب شہر میں تو آج بچہ بچہ مارا جا رہا ہے، عورتیں ماری جا رہی ہیں، جوان اور بوڑھے قتل کیے جا رہے ہیں۔ ایک اور لاش بڑھ جائے گی تو کون سا فرق پڑ جائے گا۔؟"

"صرف لاہور میں ہی تو یہ پاگل پن نہیں ہو رہا ہے ویر، امرتسر اور دلی میں بھی تو قتل عام ہو رہا ہے۔ وہاں بھی بچے جوان، عورتیں، بوڑھے قتل ہو رہے ہیں۔ وہاں کی سڑکوں پر بھی تو انسانوں کا خون بہہ رہا ہے، گھر جلائے جا رہے ہیں ـــــــ" پھر اس پری نے کار ایک جھٹکے سے روک دی اور اسٹیرنگ وھیل پر سر رکھ کر زار و قطار رونے لگی۔ جتنا وہ فرشتہ اسے چپ کراتا، دلاسہ دیتا اتنی ہی اس پری کی سسکیاں بڑھتی جاتیں۔ وہ دونوں مجھ کو بالکل بھول چکے تھے۔ مجھے ڈر ہوا کہ وہ دونوں کہیں پھر دھوئیں میں چھپے ہوئے اور خون سے لتھڑے ہوئے لاہور نہ لوٹ جائیں۔

"میں ایک بات عرض کروں؟" میں نے پچھلی سیٹ کے کونے میں دبکے ہوئے اپنے اسکول کی کتابیں دونوں ہاتھوں سے چھپائے ہوئے دبی آواز میں پوچھا۔

"ہاں ہاں کہو۔" وہ دونوں ایک ساتھ میری طرف اس طرح پلٹے کہ دونوں کے چہرے ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے۔ اپنی پریشانی میں بھی وہ دونوں بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔

"میرے خیال میں یہاں سے آگے چند میل دور پر ایک بہت بڑا چرچ ہے۔ آپ

دونوں وہاں تھوڑی دیر رک کر ستا لیجئے۔ سوچ لیجئے کہ آپ دونوں کو کیا کرنا چاہیئے۔"
میں نے ان سے کہا۔ میں نے یہ مشورہ دیئے تو دیا تھا مگر مجھے پتہ نہیں تھا کہ ہم لوگ وزیرآباد کی طرف جا رہے تھے یا فیروزپور کی طرف۔

اس پری نے جس کا نام نسیمہ تھا اپنے سرخ دوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچھ لیے اور بہت تیز رفتاری سے کار چلانے لگی۔ آسمان پر اب شام کے آثار نمودار ہو چلے تھے۔ ہم لوگ چند میل ہی گئے ہونگے کہ سڑک کے داہنی طرف، اونچے گھنے درختوں کے پیچھے چھپا ہوا ہمیں ایک چرچ نظر آگیا۔ چرچ کے گیٹ میں داخل ہونے کے بعد پھولوں کی کیاریوں کے قریب اس پری نے کار روک لی۔ میں بھی کار کا دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ کتابیں میں نے سیٹ پر نہیں چھوڑی تھیں۔ نسیمہ نے میرا دایاں ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا اور تیز تیز چلتے ہوئے چرچ میں داخل ہو گئی۔ میں نے مڑکر دیکھا وہ فرشتہ دروازے پر کھڑا تھا۔ اپنے دونوں ہاتھوں کو پھیلا کر اس نے چرچ میں داخل ہونے والے دروازے کے کیواڑ پکڑ رکھے تھے۔ اس کے پیچھے ڈوبتے ہوئے سورج کی مدھم روشنی تھی۔ اس فرشتے کا لانبا قد اور پھیلے ہوئے بازو ایک پرچھائیں سی بن گئے تھے اور مجھے ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ پرچھائیں نہیں عیسیٰ مسیح کے صلیب پر لٹکے ہوئے جسم کی تصویر ہے۔ اس اونچی چھت والے خوبصورت گرجے میں ہر طرف رنگین پھول سجے تھے اور لانبی پتلی موم بتیاں روشن تھیں۔ جگہ جگہ بی بی مریم اور ان کے بیٹے کے مجسمے تھے اور کئی جگہ چھوٹی بڑی صلیبیں تھیں۔ زندگی میں پہلی بار میں نے صلیب پر لٹکے ہوئے اس انسان کو غور سے دیکھا اور اس کے درد کی اذیت کو محسوس کیا۔ اس پری نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور بی بی مریم کے ایک بڑے سے مجسمے کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گئی۔ ڈوپٹہ کا پلو اس نے اپنے سر پر رکھ لیا۔ میں نے دیکھا کہ نسیمہ کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے

آنسو لگاتار بہہ رہے تھے۔ وہ کہہ رہی تھیں" اے مقدس ماں تم جانتی ہو کہ میں ویر کو اپنے قبضے میں نہیں کرنا چاہتی۔ میں دل سے چاہتی ہوں کہ ویر میرے ساتھ رہے ——— ہمیشہ ہمیشہ ——— کیا ایسی خواہش گناہ ہے مقدس ماں؟ اپنے دل کی یہ بات میں نے کبھی ویر سے بھی نہیں کہی ہے۔ میں کیا کروں بی بی مریم کہ میں مسلمان ہوں اور ویر ہندو اور یہ ساری دنیا پاگل ہو گئی ہے ——— وہاں باہر لوگ ایک دوسرے کو قتل کر رہے ہیں۔ معصوم بچوں کو قتل کر رہے ہیں۔ اے کنواری ماں! وہ لوگ حاملہ عورتوں کے پیٹ میں چاقو بھونک رہے ہیں۔ بی بی مریم کون پاگل ہے؟ میں جو مسلمان ہوتے ہوئے بھی ایک ہندو کو دل اور جان سے زیادہ چاہتی ہوں یا یہ سب لوگ؟ تم بتلاؤ کہ میں کیا کروں؟ میرے تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ ننھا سا فرشتہ مجھے تم سے ملانے یہاں گرجے میں لے آیا ہے۔ بی بی مریم بتلایئے کہ میں کیا کروں؟" اور پھر پری دعائیں مانگتے خاموش ہو گئی۔ اس کا سر سامنے کی طرف جھک گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ وہ فرشتہ قریب کے ایک ستون کے پیچھے سے نکل آیا۔ موم بتیوں کی روشنی اس کے پورے جسم پر پڑ رہی تھی۔

"اٹھو نسیمہ ——— آج تک میں یہ سمجھتا تھا کہ صرف میں ہی تم کو حد سے زیادہ چاہتا تھا اور تم مجھے صرف پسند کرتی تھیں۔ آج مجھے پتہ چلا کہ تم بھی مجھ سے اتنا ہی پیار کرتی ہو۔ آؤ اس مقدس مجسمے کے سامنے ہم ایک دوسرے کو شوہر اور بیوی مان لیں۔ یہ انگریز لڑکا ہمارا گواہ ہے۔"

فرشتے کے یہ الفاظ سن کر جب وہ پری میرے قریب سے اٹھی تو اس کے چہرے پر مکمل سکون تھا۔ موم بتیوں کے شعلوں کی لپک اس کے چہرے کو اور زیادہ خوبصورت

بنا رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اچانک کسی آسمانی طاقت نے نسیمہ کی ساری الجھنوں کو دور کر دیا تھا۔ رخساروں سے اس کے آنسوؤں کی نمی پونچھ دی تھی اور بہت سے نورانی پھول کھلا دیئے تھے۔ پھول جو کسی بڑے ہیرے کی چمک دمک میں ہوتے ہیں۔ میں بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ نہ جانے کیا سوچ کر پری نے اپنی کلائی سے سونے کا ایک خوبصورت کنگن اتارا اور بی بی مریم کے مجسمے کے اٹھے ہوئے ہاتھ میں پہنا دیا۔ اس فرشتے نے بھی اپنی گھڑی اتار کر نسیمہ کے کنگن کے قریب لٹکا دی اور وہ دونوں میرا ایک ایک ہاتھ مضبوطی سے پکڑے ہوئے باہر آ گئے۔ میری کتابیں فرشتے نے اپنے ہاتھ میں لے لی تھیں۔ اونچے پیڑوں کے پیچھے شفق کے سرخ رنگ تیزی سے مٹتے جا رہے تھے اور شور مچاتے ہوئے بے شمار پرندے بسیرا کرنے کے لیے ٹہنیوں پر بیٹھنے لگے تھے۔ پرندوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ وہ ایک دوسرے کے گھونسلوں کو آگ نہیں لگاتے۔

ہم لوگ کار میں بیٹھ کر پھر روانہ ہو گئے۔ اب نوجوان فرشتے نے اپنا لانبا اور طاقتور بازو کار کی سیٹ کی پشت پر کچھ اس طرح پھیلا کر رکھا تھا کہ پری کے دوپٹہ میں چھپے ہوئے کاندھے ڈھک سے گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد بارش شروع ہو گئی مگر اس شام مانسون میں اپنی پرانی تیزی نہ تھی۔ میں بھوک اور تھکن سے پریشان ہو رہا تھا۔ مجھے اپنے ممی ڈیڈی کی یاد بھی آ رہی تھی مگر میں نے اس نئے شادی شدہ جوڑے سے اپنی پریشانی کے بارے میں کچھ نہ کہا۔ خاموش رہا۔ کار کی رفتار اس بار تیز نہ تھی شاید اندھیرے، بارش اور سڑک کی ناہمواری کی وجہ سے یا شادی کے بعد نسیمہ ایکدم بہت ذمہ دار ہو گئی تھیں۔

"مسز نسیمہ سہگل" میں نے اس فرشتے کی آواز سنی۔ "ہم نے اپنی شادی کے گواہ کا نام تک نہیں پوچھا۔"

میں نے ان دونوں کو سب کچھ بتلا دیا۔ دس برس کے لڑکے کی کہانی کچھ زیادہ لمبی بھی تو نہیں ہوتی۔ اس دن سہ پہر کو اگر مجھے وہ دونوں نہ ملے ہوتے تو نہ جانے میرا کیا حشر ہوتا ــــــ کٹے ہوئے انسانی ہاتھ پیر، بوڑھوں اور جوانوں کے چہرے جن کی آنکھیں نوچ لی گئی تھیں، خون میں لتھڑی ہوئی لاشیں میری نظروں کے سامنے گھوم گئیں اور میں نے اپنا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں چھپالیا اور شاید اسی حالت میں سوگیا۔ میری آنکھ اس وقت کھلی جب کار ایک جھٹکے سے رک گئی تھی۔ بارش بند ہوگئی تھی اور باہر اندھیرے میں ہمارے کار کے سامنے ایک جیپ کھڑی تھی۔ ایک لانبے قد کا دبلا پتلا فوجی افسر اپنے بائیں ہاتھ میں روشن ٹارچ لیے ہمارے قریب آچکا تھا۔ غالباً اس کا دایاں ہاتھ کمر سے بندھی پستول پر تھا۔

"میری بٹالین کا نام فرسٹ رائل گڑھوال رائفلس ہے۔ میرا نام لفٹنٹ کرنل عابس مہدی ہے۔ ہمارا کیمپ وزیرآباد میں ہے مگر آپ لوگ کون ہیں؟ کہاں سے آرہے ہیں؟ کہاں جارہے ہیں؟" کرنل مہدی کی آواز میں تحکم تھا مگر وہ ایک ہمدرد انسان کی آواز لگتی تھی۔

"میرا نام ویر سہگل ہے۔" کرنل صاحب نے ٹارچ کی روشنی فرشتے کے چہرے کی طرف کردی جو دمک رہا تھا۔ "یہ جو کار چلا رہی ہیں میری بیوی ہیں۔ ہماری شادی ابھی بالکل نئی نئی ہے۔ ہم لوگ لاہور میں رہتے تھے اب دلی جانا چاہتے۔ لاہور میں ہندو مسلمان اور سکھ ایک دوسرے کو قتل کر رہے ہیں۔ ہم لوگ جان بچا کر بھاگ نکلے ہیں اور اپنی حفاظت کے خیال سے کچے راستوں سے جارہے ہیں اور یہ چھوٹا سا انگریز لڑکا ہمیں راستے میں ملا تھا۔" میرا ذکر آتے ہی کرنل صاحب نے روشنی میرے چہرے کی طرف موڑ دی۔

"تمھارا نام کیا ہے؟" کرنل مہدی نے پوچھا۔

"روڈنی نورٹن۔" میں نے کہا۔

"کیا تمھارے والد میری طرح برطانوی فوج میں کام کرتے ہیں ؟" کرنل صاحب نے پوچھا۔

"جی نہیں۔ روڈنی کے ممی اور ڈیڈی لاہور کے اسکول میں پڑھاتے ہیں۔ آج جب یہ اسکول سے گھر لوٹا تو محلہ میں قتل اور غارت گری کا بازار گرم تھا۔ دیکھنے میں روڈنی بچہ ہے مگر یہ بہت ذہین اور سمجھدار ہے اور بہادر بھی۔"

"روڈنی تم ہمارے ساتھ ہمارے کیمپ میں رک جاؤ۔ ہماری جیپ میں ساتھ چلو۔ چند گھنٹے میں ہم وزیر آباد پہنچ جائیں گے۔ کل ہم تمہارے ماں باپ کو ڈھونڈ نکالیں گے۔ لاہور کے پراگنزہ ہوٹل میں فوج کا پڑاؤ ہے شہر کے بہت سے لوگ اس ہوٹل میں پناہ لینے گئے ہوں گے۔ روڈنی تمھاری قسمت اچھی تھی کہ یہ دونوں مل گئے۔ آج کل ہر طرف جان کا خطرہ ہے۔" کرنل صاحب نے یہ باتیں مجھے ڈھارس بندھانے کے لیے کہی ہونگیں میں اپنے فرشتے اور اپنی پری کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا مگر دوسرے دن اپنے ممی ڈیڈی سے ملنے کے خیال سے میں خوش ہو گیا۔

"فوج بھی تو قتل کرتی ہے۔" میں نے کار سے اتر کر ملبے سے کرنل صاحب سے کہا۔ کتابیں میرے ہاتھ میں تھیں۔

"بے مقصد قتل تو صرف غیر فوجی کرتے ہیں۔ ہم جب ملک کے دشمنوں سے لڑتے ہیں تو جان لے کر یا جان دے کر ہی دم لیتے ہیں مگر جب عوام کو بچانے کا کام ہمیں دیا جاتا ہے تو ایک ۔ان کی ممتا جیسی ہمدردی ہم میں آجاتی ہے۔ روڈنی تمھیں ہم سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔" کرنل صاحب مجھ سے باتیں کر رہے تھے۔ اتنی دیر میں پری اور فرشتہ بھی کار سے باہر آگئے۔ کرنل صاحب ان سے کہنے لگے۔ "دونوں ملکوں کے درمیان سرحد کے بارے میں تو ابھی کسی کو بھی ٹھیک سے

پتہ نہیں مگر یہاں سے چند میل دور ہمیں ایک محفوظ جگہ معلوم ہے۔ آپ وہاں سے سلطان پور ہوتے ہوئے لدھیانہ اور پھر آگے چلے جایئے گا۔ امرتسر میں حالات بہت خراب ہیں۔ ہماری رائل گڑھوال رائفلس کے ذمہ دونوں ملکوں سے لوگوں کو ادھر سے ادھر پہنچانے کی ذمہ داری ہے میں ایک فوجی جوان آپ کے ساتھ کیے دیتا ہوں۔ مناسب یہی ہے کہ آپ دونوں رات کے اندھیرے میں ہندوستان کے لیے روانہ ہو جائیں۔"

"کرنل مہدی،" میری خوبصورت سی پری نے ان سے کہا۔ "مہربانی کر کے آپ کسی ایسے آدمی کو ہمارے ساتھ بھیجئے جسے کار چلانا آتی ہو۔" یہ کہہ کر وہ میرے قریب آگئی اور مجھے گلے سے لگالیا۔ "شاید اب ہم کبھی نہیں ملیں گے روڈنی۔ آج سہ پہر کو کھیتوں کے کنارے جب میں نے تمھیں کھڑا دیکھا تو میرے دل نے کہا یہ نیلی آنکھوں اور سنہرے بالوں والا لڑکا دراصل ایک ننھا سا فرشتہ ہے۔ ہمارے ساتھ چند گھنٹے رہنے کا شکریہ۔ تمھاری وجہ سے مجھے بہت سکون ملا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کل تمھارے ماں باپ تمھیں مل جائیں گے۔"

"گڈ لک ینگ مین۔" فرشتے نے میرے قریب آکر مجھ سے ہاتھ ملایا۔ "روڈنی آج نہ تمھارا کوئی پتہ اور ٹھکانا ہے اور نہ ہمارا مگر کل یا پرسوں یا کچھ دن بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اچانک یہ بہت برا دور آگیا ہے مگر تم ہمت سے کام لینا۔ کیا تم کسی چیز پر بھروسہ رکھتے ہو۔؟"

"یس سر۔" میں نے جواب دیا۔

"کس چیز پر روڈنی؟" انھوں نے پوچھا۔

"فرشتوں اور پریوں پر ——— میں نے آپ کی کار اس کچی سڑک پر آتے ہوئے دیکھ کر سوچا تھا کہ اس میں فرشتے بیٹھے ہونگے جو میری مدد کریں گے۔ آپ فرشتے ہیں نا اور وہ پری؟ کیوں ہے نا، سر؟" میں نے اپنے خلوص کی پوری گہرائی سے پوچھا تھا۔ کرنل

صاحب اور وہ دونوں ہنس پڑے اور پھر اس فرشتے نے مجھے اوپر اٹھا لیا اور اتنی محبت سے لپٹایا کہ تیس برس گذر جانے کے بعد بھی مجھے ان کے چوڑے سینے اور مضبوط بازوؤں کے بیچ میں دبے رہنا یاد ہے۔ زمین پر اتارتے ہوئے انھوں نے کہا۔

"روڈنی نورٹن تم ہم دونوں سے وعدہ کرو کہ کبھی ہمت نہیں ہاروگے۔"

"وعدہ کرتا ہوں سر، میں آپ دونوں سے وعدہ کرتا ہوں۔" میں نے ان کے چہرے باری باری دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمھیں بھروسہ رکھنا چاہیئے روڈنی چاہے وہ دریا کے بہتے ہوئے پانی کے اوپر اڑتے ہوئے بادلوں کے سایے پر ہی کیوں نہ ہو۔" فرشتے نے مجھے سمجھایا۔"سب ٹھیک ہو جائیگا۔ جلے ہوئے مکانات پھر سے تعمیر ہونگے، اجڑے ہوئے کھیتوں میں نئی فصلیں بوئی جائیں گی اور خون میں ڈوبی ہوئی تلواریں، کرپانیں اور چاقو سب کو دھو دیا جائے گا اور آج جو یہ لوگ ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں کل پھر بھائی بھائی ہو جائیں گے۔ تم بھروسہ رکھو۔" اور پھر وہ دونوں کار میں بیٹھ گئے اور پچھلی سیٹ پر جہاں میں بیٹھا تھا وہاں ایک فوجی جوان بڑی سی بندوق لے کر بیٹھ گیا کار چلنے لگی۔ وہ فرشتہ اور پری اپنے ہنی مون پر ایک ایسی منزل کی طرف روانہ ہو گئے جہاں قتل ہو رہے تھے، گھر لوٹے جا رہے تھے، تباہی مچی ہوئی تھی اور میں کرنل صاحب کے ساتھ ان کی کھلی ہوئی جیپ میں بیٹھ گیا۔ اپنی کتابوں کو پکڑے ہوئے ہم وزیر آباد کی طرف چلنے لگے۔ کرنل صاحب کہنے لگے۔

"روڈنی کتنا خوبصورت جوڑا ہے ان دونوں کا۔ اس زمانے میں بھی ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے اتنی محبت کر سکتے ہیں۔"

صبح جب میں کرنل صاحب کے خیمے سے سو کر باہر نکلا تو وہ بڑی کالی کار ان کی جیپ

کے پاس کھڑی تھی۔ نسیمہ سہگل نے کرنل صاحب سے درخواست کی تھی کہ کار لاہور میں اُس کے باپ کی کوٹھی کے احاطہ میں پارک کر دی جائے۔ نسیمہ کی خواہش تھی کہ ان کے گھر والوں کو یہ پتہ نہ چلے کہ اس نے ایک ہندو نوجوان سے شادی کر لی تھی اور ہندوستان سکونت اختیار کرنے چلی گئی تھی۔ کرنل صاحب نے نسیمہ کی خواہش کا پورا احترام کیا۔"

لندن کے قریب پہنچتی ہوئی بھاگتی دوڑتی ٹرین کے اس خالی ڈبے میں یہ دردناک کہانی روڈنی نورٹن صاحب نے مجھے رک رک کر سنائی تھی۔ کبھی ان کی آواز جذبات سے بھر جاتی، کبھی ان کی بڑی نیلی آنکھوں میں آنسو کپکپانے لگتے، کبھی چہرہ جوش سے سرخ ہو جاتا اور کبھی وہ خاموش ہو کر شاید اپنی کہانی کا تسلسل ڈھونڈنے لگتے۔ کبھی وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے تو کبھی اپنی بند مٹھیوں کی سفید رنگت کو، کبھی وہ نظریں اٹھا کر مجھے دیکھ لیتے اور کبھی مجھے ایسا لگتا جیسے وہ خود سے باتیں کر رہے تھے۔ ان کی کہانی ختم ہونے سے پہلے ٹرین لندن کے طویل اور عریض شہر میں داخل ہو چکی تھی ——— ہر شہر ٹرین میں بیٹھے ہوئے مسافروں سے اپنا تعارف خود کروا دیتا ہے۔ سڑکوں پر بھاگتی کاریں تھیں، سرخ ٹائل کی چھتوں والے گھروں کی قطاریں تھیں اونچی اونچی بلڈنگیں تھیں، ایک جگہ میں نے کئی سو کاروں کے انبار لگے دیکھے۔ مجھے تعجب ہوا۔

"یہ کاروں کا قبرستان ہے" روڈنی نورٹن صاحب اپنی سنائی ہوئی کہانی کے تاثر سے اب آہستہ آہستہ آزاد ہونے لگے تھے۔ "اب ہم لندن برج پر رکیں گے اور پھر تمہارا مشہور واٹرلو اسٹیشن ہے۔ میں وہاں اتر جاؤنگا۔ اگلا اسٹیشن چیرنگ کراس کا ہے جہاں تمہیں جانا ہے وہ دریائے ٹیمز پار کرنے کے بعد آئے گا۔"

"آپ واٹرلو کے قریب کہیں رہتے ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں شبیہ احمد ——— رہتا بھی ہوں اور کام بھی وہیں کرتا ہوں۔ وہاں مشہور انڈیا

آفس لائبریری ہے۔ میں وہیں کام کرتا ہوں۔ تمھیں فرصت ہو تو کسی دن چلے آنا۔ میں تمھیں اپنے لاہور کے اسکول کی کتابیں دکھلاؤنگا۔" نورٹن صاحب نے کہا۔

"میں ضرور آؤنگا۔" میں نے ان سے اس وقت کہا جب وہ واٹرلو کے تاریک اسٹیشن پر اپنا چھوٹا بیگ، اپنی برساتی اور چھتری لیے اترنے لگے۔

میں لندن میں کوئی ہفتہ بھر رہا۔ تاریخی مقامات دیکھے، خوب گھوما، بڑی بڑی شاندار دوکانوں میں اپنے لیے اور اپنے عزیزوں کے لیے تحفے خریدے۔ کینٹش ٹاؤن کے پاس ٹرنکوں کی بہت ساری دوکانیں دیکھیں۔ تیجی کے لیے کئی خوبصورت اسکارف خریدے۔ تیجندر کور بیدی اور میں کالج میں ساتھ پڑھتے تھے۔ اپنے کھلے ہوئے بالوں کو وہ اکثر کسی رنگین اسکارف سے باندھ لیتی تھی۔ پتہ نہیں اچانک دلی سے اتنی دور لندن میں مجھے تیجی کا اور اس کے خوبصورت بالوں کا خیال کئی بار کیوں آیا تھا۔ کہیں یہ نورٹن صاحب کی کہانی کا تو کوئی اثر نہیں تھا۔ رات کو وائی۔ ایم۔ سی اے کے ہوسٹل میں اپنے بستر پر لیٹ کر میں یہی سوچا کرتا تھا۔

مجھے اگست کا مہینہ ختم ہونے سے پہلے دلی لوٹ جانا تھا۔ انگلستان کے اخباروں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اچانک ایک خبر دھماکے کی طرح نشر ہوئی۔ آئرِش دہشت پسندوں نے ۷۹ سالہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی کشتی کے بم سے پرخچے اڑا دیئے تھے اور ہندوستان کے آخری ویسرائے اور پہلے گورنر جنرل کو ہلاک کر دیا تھا۔ ہر شخص اس افسوسناک واقعہ سے متاثر تھا۔ واٹرلو کے چوڑے پل پر چہل قدمی کرتا ہوا میں اسٹیشن کے قریب واقع انڈیا آفس لائبریری چلا گیا خوب بادل چھائے ہوئے تھے۔ دوپہر میں بھی اندھیرا تھا۔ نورٹن صاحب کے چہرے پر مجھے دیکھتے ہی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"آؤ شیبہ آؤ۔ مجھے امید تھی کہ تم ملنے ضرور آؤ گے۔" انھوں نے محبت سے کہا۔ لائبریری میں

ان کے چھوٹے سے کمرے میں بیٹھے ہم دونوں بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔

"میں ابھی انڈیا ہاؤس سے آرہا ہوں۔ ہمارے سفارت خانے میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی درد ناک موت پر بہت افسوس کیا جارہا ہے۔" میں نے انھیں بتلایا۔

"افسوس کی بات بھی ہے۔ ماؤنٹ بیٹن اور آزاد ہندوستان کی تاریخ میں گہرا واسطہ ہے اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ایک عظیم انسان تھے۔ مگر شبیہ ۳۲ برس پہلے میں نے جو کچھ پنجاب میں دیکھا تھا اس کا ذمہ دار میں ماؤنٹ بیٹن کو بھی ٹھہراتا ہوں۔" نورٹن صاحب کے اعتراض میں ایک ایسی تلخی تھی جو ذاتی تجربات کی ناخوشگواری کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

"آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ اتنے بڑے آدمی پر بھی اعتراض کیا جاسکتا ہے۔

"ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان جیسے بڑے ملک کے بٹوارے کے لیے صرف ۷۳ دن کی مہلت دی تھی۔ ایک چھوٹے سے گھر کے بٹوارے میں کہیں زیادہ وقت لگتا ہے۔ انھوں نے بغیر کسی سے مشورہ کے آزادی کی تاریخ ۱۵ اگست رکھ دی تھی۔" نورٹن صاحب نے کہا۔

"۱۵ اگست ہی کیوں؟ کوئی اور تاریخ کیوں نہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"دوسری جنگ عظیم میں برما کے جنگلوں میں جاپانیوں نے ۱۵ اگست کو اپنی شکست کا اعتراف کیا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن کے لیے وہ تاریخ ذاتی کامیابی کی نشاندہی کرتی تھی۔ دنیا کی تاریخ میں کبھی اتنے لوگوں نے ایک ملک سے دوسرے ملک کو ہجرت نہیں کی۔ ہندوستان سے ۷۵ لاکھ مسلمان پاکستان گئے اور تقریباً اتنے ہی لوگ پاکستان سے ہندوستان آئے۔ دس لاکھ سے زیادہ عورتیں، مرد، بوڑھے، بچے، جوان مارے گئے۔ تمھارے ملک کی ایک پرانی کہاوت ہے کہ آدمی جب مرتا ہے تو اسے لگتا ہے کہ چھ ہزار بچھوؤں نے اسے ڈنک مار دیا ہو۔ اس بٹوارے نے چھ کروڑ

بچھوؤں کو انسانوں کے جسموں میں ڈنک کا زہر اتارنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔" نورٹن صاحب نے کہا۔

"آپ نے کہا تھا کہ آپ اپنے اسکول کی کتابیں مجھے دکھلائیں گے۔" مجھ سے نورٹن صاحب کی اداسی دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ چھ کروڑ بچھوؤں کے ہر طرف رینگتے رہنے کا خیال ہی میرے جسم کو سن کیے دے رہا تھا۔ یہ اتفاق تھا کہ میں اس تکلیف دہ دور کے بعد پیدا ہوا تھا۔

"ہاں ہاں، یہ دیکھو" انھوں نے اپنی میز پر سلیقے سے رکھی ہوئی کتابوں کو شیلف سے نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ ہر کتاب کو بڑی محبت اور حفاظت سے رکھا گیا تھا۔ میں ان سے سوالات پوچھتا رہا اور وہ جواب دیتے رہے۔ بیس سال سے وہ اس لائبریری میں کام کر رہے تھے۔ شاید انھوں نے وہاں کی ہر کتاب کئی بار پڑھ ڈالی تھی۔ وہاں اردو کی بھی کئی سو کتابیں تھیں۔

"نورٹن صاحب، آپ کو اپنا یہ کام بہت پسند ہے کیا؟" میں نے پوچھا۔

"کام تو کرنا ہی ہے۔ یہاں تنہائی ہے، خاموشی ہے، کتابیں ہیں، سوچنے کا موقع ملتا ہے۔ مجھے اچھا لگتا ہے۔ تم بھی تو کام کرتے ہو۔ اپنے کارخانے میں ٹرنک بنواتے ہو اور اپنے ہندوستان کے کونے کونے میں بیچتے ہو، اب دوسرے ملکوں میں بھی بیچنے لگو گے مگر جب تم خود سفر کرتے ہو تو تمھارے ساتھ ٹرنک کے بجائے کالے رنگ کے چمڑے کا خوبصورت سوٹ کیس ہوتا ہے۔" نورٹن صاحب مسکرا رہے تھے۔ ان کی نیلی آنکھیں ذرا دب گئی تھیں اور آنکھوں کے قریب ننھی ننھی جھریاں پڑ گئی تھیں۔

"میں کل صبح دلی واپس جا رہا ہوں" میں نے کوئی ڈیڑھ گھنٹہ نورٹن صاحب سے باتیں کرنے کے بعد ان سے کہا۔ "آپ نے اور آپ کی باتوں نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔"

"شبیہ تم یہ نہ سوچنا کہ پنجاب کے فسادات ہندو، اسلام اور سکھ مذہبوں کے ماننے والوں کی آپسی لڑائی تھے۔ اس خوف، دہشت، نفرت اور قتل و خون کے اور بھی اسباب تھے۔ کسان

کو اس کے کھیتوں سے، لوگوں کو ان کے مکانوں سے، انسانوں کو ان کے وطن سے جب کسی حکومت کا قانون جدا کر دیتا ہے تو ہر طرف تباہی کے رنگ پھیل جاتے ہیں۔ دنیا کے ہر وکیل جو جو جائیداد کے بٹوارے کے مقدمے کرتا ہے یہ حقیقت جانتا ہے۔ تم اپنی تاریخ کو پڑھتے رہو، خود ان چیزوں کے بارے میں سوچو، سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر ہندوستان کے بٹوارے کے وقت پھیلی ہوئی عجیب و غریب آگ کو فرقہ واریت کا نام نہ دو۔ تم اپنے وطن واپس جاؤ مگر ایک بات یاد رکھنا۔ کسی نہ کسی چیز پر بھروسہ رکھو۔" نورٹن صاحب نے مجھے ہدایت کرتے ہوئے کہا۔

"چاہے یہ بھروسہ دریا کے تیزی سے بہتے ہوئے پانی کے اوپر اڑتے ہوئے بادلوں کے بھاگتے ہوئے سلسلے پر ہی کیوں نہ۔" میں نے کہا اور ہم دونوں مسکرانے لگے۔ نورٹن صاحب کو خوشی ہوئی تھی کہ میں نے ان کی باتوں کو اتنے دھیان سے سنا تھا۔

نورٹن صاحب کو خدا حافظ کہتے وقت مجھے اس بات کا گمان بھی نہیں تھا کہ ٹرین میں ان سے اتفاقیہ ملاقات کا تجربہ میری بقیہ زندگی میں سوچنے سمجھنے اور حالات کو پرکھنے کے انداز کو بدل دے گا۔ مجھے یوروپ سے دلی لوٹ کر آئے کئی مہینے ہو گئے تھے۔ تیجی کو میرے خریدے ہوئے اسکارف بہت پسند آئے تھے۔ اب تو مجھے اس سے کہنا پڑتا "تیجی اپنے خوبصورت بالوں کو کبھی بغیر اسکارف کے بھی دیکھ لینے دو۔" اور وہ مسکرا کر کہتی کہ "خود لندن سے میرے لیے تحفہ لائے ہو اور خود اس کے استعمال کرنے سے منع کرتے ہو۔" پھر ایک دن اخبار میں اتفاقاً میں نے دلی کے ایک مشہور جرنلسٹ، ویر سہگل، کے انتقال کی خبر پڑھی اور مجھے اچانک روڈنی نورٹن کی وہ کہانی پوری تفصیل سے یاد آ گئی جو انھوں نے ڈوور سے لندن جاتے وقت مجھے سنائی تھی۔ مجھے ان کے بات کرنے کا انداز یاد آیا جو صرف اس وجہ سے مغرور لگتا تھا کہ نورٹن صاحب دس برس کی عمر سے تنہائی کی آگ میں سلگتے رہے تھے۔ اخبار میں لکھا تھا کہ ویر سہگل جو لاہور

کے رہنے والے تھے دل کی حرکت بند ہو جانے سے ایک رات پہلے انتقال کر گئے تھے۔ مجھے ڈر ہوا کہ یہ سہگل صاحب کہیں روڈنی نورٹن کے فرشتے تو نہیں تھے۔ اور اگر تھے تو مجھے ان کو ڈھونڈ نکالنے میں دیر ہو گئی تھی مگر نورٹن صاحب نے مجھے ان کو ڈھونڈنے کے لیے کہا بھی تو نہیں تھا۔ اپنے عقیدوں کی سچائی پر روڈنی نورٹن کو بہت بھروسہ تھا۔ ان کو یقین رہا ہوگا کہ دنیا میں فرشتے ہوتے ہیں اور اس بات کا ثبوت ملنے کے بعد مزید تصدیق کرنے کی انھیں ضرورت نہیں محسوس ہوتی تھی۔

میں نے اخبار کے دفتر سے ویر سہگل صاحب کے مکان کا پتہ معلوم کیا اور رتیجی کو ساتھ لے کر ان کے گھر چلا گیا۔ ہر طرف سوگ کی کیفیت تھی۔ سفید ساڑیاں پہنے ہوئے کئی عورتیں تھیں۔ غم سے ٹوٹے ہوئے کئی مرد تھے۔

"ہم مسز سہگل سے ملنے آئے ہیں۔" میں نے دالان میں بیٹھے ہوئے ایک پچیس چھبیس برس کے نوجوان سے کہا جو باہر ورانڈے میں ایک کرسی پر اپنی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے کئی دن سے جیسے شیو نہیں کیا تھا۔ آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ وہ خاموش اپنی کرسی سے اٹھا اور مجھے اور رتیجی کو اندر ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ وہاں کئی عورتیں بیٹھی تھیں۔

"ممی" اس نے ایک خاتون کو مخاطب کیا۔ "یہ لوگ آپ سے ملنے آئے ہیں۔"

مجھے ڈر لگا ہوا تھا کہ کہیں ہم غلط آدمی کا پرسہ دینے تو نہیں آ گئے ہیں۔ رتیجی کی موجودگی سے ایک طرح کا سہارا سا تھا۔ ہم دونوں نے مسز سہگل کو ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا۔

"آپ یہاں قریب آ کر کرسیوں پر بیٹھ جائیے۔" مسز سہگل کا لہجہ پنجابی تھا پھر وہ اس نوجوان سے کہنے لگیں جو ورانڈے سے ہمیں ساتھ اندر لایا تھا۔ "روڈنی بیٹے ان دونوں کے لئے چلئے کا انتظام کر دینا۔"

مسز سہگل کے منہ سے ان کے نوجوان بیٹے کا نام سن کر میں چونک پڑا۔ میں نے مسز سہگل کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہ پچاس سے زیادہ کی ہو رہی ہونگیں۔ سر کے بال سفید ہو چلے تھے اپنے عزیز شوہر کی دائمی جدائی کا غم ان کی آنکھوں میں آنسو بن کر تیر رہا تھا، آواز کی کپکپاہٹ میں شامل تھا۔ ان کے چہرے کے خوبصورت نقوش، ان کے بیٹھنے کا انداز ان کی گفتگو کا طریقہ سب حد سے زیادہ سوگوار لگ رہے تھے۔

"آپ ہمیں نہیں جانتیں" میں نے ان سے کہا۔ "سہگل صاحب بھی ہمیں نہیں جانتے تھے۔ ان کے انتقال کی خبر کل میں نے اخبار میں پڑھی۔ چند مہینے پہلے لندن میں میری ملاقات اتفاقاً ایک انگریز سے ہوئی تھی۔ انھوں نے آپ دونوں کا ذکر مجھ سے کیا تھا۔ ان کا نام روڈنی نورٹن ہے۔" میری بات سن کر مسز سہگل نے مجھے کچھ شکایت کی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں کہ اس سوگ کے موقع پر خوشی کی بات کیوں سنا رہے ہو۔ ان کے غمزدہ چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ دریا کے تیزی سے بہتے ہوئے پانی پر بادلوں کے سایے کی طرح۔ ان کا بیٹا چائے کی دو پیالیاں لیے ہمارے قریب آچکا تھا۔

"آپ لندن میں روڈنی سے مل کر آئے ہیں۔" مسز سہگل نے آہستہ سے کہا۔ "کتنی عجیب بات ہے۔ دو دن پہلے تک ویر زندہ تھے اور روڈنی کو یاد کر رہے تھے۔ ہم لوگ جب سے لاہور سے آئے ہیں روڈنی کی باتیں کرتے رہتے ہیں مگر ہمیں روڈنی کی کوئی خبر نہیں معلوم ہوئی۔ آج ویر کے انتقال کے بعد آپ آئے ہیں، روڈنی سے مل کر آئے ہیں، آپ کو اس کا آنکھوں دیکھا حال معلوم ہے۔ ویر زندہ ہوتے تو کتنا خوش ہوتے۔" مسز سہگل نے اپنے سفید دوپٹے میں اپنا منہ ڈھانپ لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ روڈنی سہگل نے چائے کی پیالیاں مجھے اور تیجی کو دے دیں اور اپنی ماں کے قریب بیٹھ گیا ان کے جھکے ہوئے کاندھوں کو اپنے لمبے

لمبے بازو سے ڈھاک دیا۔

"کیسا ہے روڈنی؟ میرا ننھا سا خوبصورت فرشتہ۔" مسز سہگل نے اپنے بیٹے کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ یہ سوال پوچھتے پوچھتے وہ پھر رونے لگیں۔ میں نے مڑکر اپنے برابر کی کرسی پر بیٹھی ہوئی پتجی کو دیکھا۔ وہ ایک پھولدار اسکارف کے ریشم میں اپنے پتلے پتلے آنسو جذب کرنے میں مشغول تھی۔

"روڈنی نورٹن اب ننھے سے کہاں رہے ہیں۔ کوئی چھ فٹ کا تو قد ہوگا۔ دبلا پتلا مگر طاقتور جسم ہے۔ لندن میں واٹرلو اسٹیشن کے پاس ایک لائبریری میں کام کرتے ہیں۔ ابھی تک شادی نہیں کی۔ آپ کو اور سہگل صاحب کو بہت یاد کرتے ہیں۔ ان کے دفتر کی میز پر ابھی تک وہ کتابیں رکھی ہیں جو وہ لاہور کے اسکول میں پڑھتے تھے۔" میں نے کہا۔

"ہاں مجھے یاد ہے ——— اس دن جب لاہور سے کئی میل دور کھیتوں کے کنارے کچی سڑک پر جب میں نے روڈنی کو دیکھ کر اپنی کار روکی تھی تو اس کے ہاتھوں میں کتابیں تھیں۔ وہ جب بھی کار سے اترتا کتابوں کو ساتھ لیے اترتا۔" مسز سہگل کو تیس تیس برس پہلے گذرے واقعات یاد آنے لگے۔ کسی قریبی رشتہ دار کی موت یادداشت کو ایک نئی توانائی دے دیتی ہے

"آپ کی کار کرنل مہدی نے دوسرے دن ہی آپ کے والد کے بنگلے تک پہنچادی تھی۔" میں نے انھیں بتلایا جیسے میں اپنی اور روڈنی نورٹن کی ملاقات کا ثبوت دے رہا تھا۔

"ہاں مجھے معلوم ہے۔ کوئی سال بھر پہلے میں اور میرا بیٹا لاہور گئے تھے۔ ویر کا بہت دل لاہور جانے کو چاہتا تھا مگر موقع نہیں ملا۔ تب بہت ساری باتیں معلوم ہوتیں۔ روڈنی کے ماں باپ تو بہت بوڑھے ہو گئے ہونگے۔" مسز سہگل نے پوچھا۔

"آپ کے اور سہگل صاحب کے روانہ ہونے بعد ایک رات تو نورٹن صاحب وزیر

آباد کے فوجی کیمپ میں رہے اور پھر دوسرے دن کرنل صاحب کی جیپ میں بیٹھ کر لاہور اپنے محلہ میں گئے۔ ان کا گھر جلا ہوا پڑا تھا اور اس کے اندر باہر بہت سے لوگوں کی جلی ہوئی لاشیں تھیں اور لاشوں پر بھنکتی ہوئی ہزاروں مکھیاں۔ روڈنی نورٹن صاحب کو کسی نے بتایا تھا کہ جب اس محلہ میں فسادات شروع ہوئے تو بہت سے لوگ ان کے گھر پناہ لینے کے لیے آگئے۔ محلہ داروں کا ایک مشتعل جلوس ان کے گھر گیا کہ پناہ گزینوں کو ان کے حوالے کر دیا جائے۔ روڈنی نورٹن کے ماں باپ نے صاف انکار کر دیا۔ جب ہجوم نے گھر کو آگ لگانا شروع کیا تو بہت سے ہمسایوں نے ان انگریزوں اور ان کے پناہ گزینوں کی حمایت کی۔ آپس میں لڑائیاں ہوئیں بہت سے لوگ مارے گئے اور پھر روڈنی نورٹن کے گھر کو بری طرح جلا دیا گیا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ جلی ہوئی لاشوں میں ہندو، مسلمان یا انگریز کو پہچاننا ناممکن ہوتا ہے۔" میں نے مسز سہگل کو یہ سب حالات بتلائے۔ لندن میں اپنی لائبریری کے چھوٹے سے کمرے میں نورٹن صاحب نے میرے سوالوں کے جواب میں اپنی کہانی کا یہ دردناک حصہ بھی مجھے سنایا تھا۔

"اوہ بیچارہ روڈنی۔" مسز سہگل نے اپنے بیٹے کے ہاتھ کو اور مضبوطی سے پکڑ لیا۔ مسز سہگل کے آنسو ان دونوں کے ہاتھوں پر تیزی سے گر رہے تھے۔" کاش وہ ہمارے ساتھ ہندوستان آگیا ہوتا مگر ہمیں یقین تھا کہ وہ اپنے ماں باپ کو ڈھونڈ نکالے گا۔ انگریزوں کا تو ان فسادات سے کوئی تعلق ہی نہ تھا۔"

"برطانوی فوج نے روڈنی نورٹن کو لندن تو پہنچا دیا مگر جوان ہونے تک ان کی زندگی ایک یتیم خانے کے بے رحم ماحول میں گذری مگر ان سب تلخیوں کے باوجود ان کو اس بات پر فخر ہے کہ وہ ایک مہربان فرشتے اور خوبصورت پری کی شادی میں بطور گواہ کے شریک ہوئے تھے۔" میں نے مسز نسیمہ سہگل اور ان کے بیٹے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"فسادات سے پہلے مجھے خود پر بڑا اعتماد تھا۔ سارے فیصلے خود ہی کر لیا کرتی تھی۔ ویر اور میں ایک دوسرے کو بتائے بغیر ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے مگر شادی کرنے کا خیال ہمارے ذہنوں میں نہیں آیا تھا۔ ان دنوں ہندو مسلمان کی شادی اتنی عام نہیں تھی جتنی آج کل ہو گئی ہے۔" مسز سہگل نے مجھے اور تیجی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں خود اپنے ہم عمر کتنے ایسے جوڑوں کو جانتا ہوں جہاں شوہر اور بیوی میں سے ایک مسلمان ہے اور ایک ہندو۔" میں نے مسز سہگل کی بات سے اتفاق کیا۔ وقت گذر جائے تو نفرت بدل جاتی ہے۔ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے لوگ شادی بیاہ کے ریشمی دھاگوں میں بندھ کر ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں۔

"لاہور میں جب فسادات پھیلنا شروع ہوئے تو مجھے صرف ویر کی جان بچانے کا خیال تھا۔ اس کے والدین اور رشتہ دار چند ہفتے پہلے ہی لاہور سے دلی روانہ ہو گئے تھے۔ صرف ویر رک گیا تھا میری وجہ سے۔ اس دن میں ویر کو اپنے ابا کی کار میں بٹھا کر سرحد کی طرف چل نکلی تھی۔ ہم دونوں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ سرحد ہے کہاں۔ اس دن ہم کو شادی کرنے کا خیال نہیں تھا۔ ہر طرف نفرت کی گھناونی آگ پھیلی تھی۔ ایسی آگ سے روشنی نہیں ہوتی۔ سایے اور زیادہ ڈراونے اور بھیانک ہو جاتے ہیں ـــــــــ اس شدید ذہنی کرب اور الجھن کے وقت ننھے سے روڈنی نے ہمیں رائے دی ہم چرچ میں جا کر ستالیں اور اپنے بارے میں سوچ لیں۔" مسز سہگل روڈنی نورٹن کے اس احسان کی آج بھی معترف تھیں جب کہ تین دہائیوں بعد ان کا سہاگ لٹ چکا تھا۔

"آپ نے بی بی مریم کے مجسمے کے ہاتھ میں اپنا سونے کا کنگن پہنا دیا تھا۔" میں نے مسز سہگل کو یاد دلایا۔

"ہاں وہ کنگن میری دادی نے مجھے دیا تھا۔ مجھے بہت عزیز تھا۔ ویر نے اپنی گھڑی پیش کی تھی۔ اس وقت ہمارے پاس نذرانے کے لئے کچھ اور تھا ہی نہیں۔ اس گرجے میں جانے کے بعد مجھے غیر معمولی سکون ملتا تھا حالانکہ ان دنوں مذہب کا ذکر ہوتے ہی دم گھٹنے لگتا تھا۔ مجھے اور ویر کو شادی کا فیصلہ کرنے میں دیر نہ لگی۔ ہمیں محسوس ہوا کہ جیسے کسی آسمانی طاقت نے ہماری تمام مشکلات کو دور کر دیا تھا۔" مسز سہگل کو شاید وہ منظر یاد آ رہا ہو گا جب وہ سرخ دوپٹہ کے آنچل سے اپنا سر ڈھکے بی بی مریم کے مجسمے کے سامنے دو زانو بیٹھی ہوئی زار و قطار رو رہی تھیں اور نیلی آنکھوں اور سنہرے بالوں والا ایک دس برس کا لڑکا انھیں قریب سے ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا اور پھر ایک ستون کے پیچھے سے نکل کر ویر سہگل نے شادی کی تجویز پیش کر دی تھی اور جب ان دونوں نے اس اونچی چھت والے گرجے میں ایک دوسرے کو شوہر اور بیوی مانا تھا تو پتلی لانبی موم بتیوں کے شعلوں کی روشنی ان پر پڑ رہی تھی۔

"روڈنی نورٹن کہتے ہیں کہ کسی نہ کسی چیز پر بھروسہ یا عقیدہ ضرور رکھنا چاہئے۔ وہ شاید آج تک آپ کو ایک مہربان پری سمجھتے ہیں اور سہگل صاحب کو ایک نیک فرشتہ۔" میں نے کہا اور مسز سہگل میری بات سن کر مسکرانے لگیں۔

"آپ مجھے روڈنی کا پتہ دیں۔ میں اسے خط لکھنا چاہتی ہوں۔ پچھلے برس جب میں اپنے بیٹے کے ساتھ لاہور گئی تھی تو میں نے وہ گرجا بہت ڈھونڈا جہاں روڈنی ہمیں لے گیا تھا اور میری اور ویر کی شادی ہوئی تھی۔ شاید روڈنی کو اس گرجے کا اتہ پتہ یاد ہو وہ چرچ ہمیں تو نہیں ملا۔" مسز سہگل نے کہا۔

"کیوں کیا وہ گرجا توڑ دیا گیا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں ایسا تو نہیں ہوا ہو گا۔ میرے چھوٹے بھائی اب وہاں پولس کے بڑے افسر ہیں

میں ان کے ساتھ ان ہی راستوں پر کار لے گئی جیسا اس دن لے گئی تھی جب لاہور میں فسادات چھڑ گئے تھے اور مجھے اور ویر کو روڈنی اپنی کتابیں اٹھائے کھیتوں کے کنارے کھڑا ملا تھا۔ اب بہت سی سڑکیں پکی ہو گئی ہیں، بہت سے کھیت بدل سے گئے ہیں مگر ہم نے وہ پورا علاقہ چھان ڈالا۔ وہاں کے لوگوں سے پوچھ لیا جو کئی کئی پشتوں سے وہاں رہتے آئے ہیں۔ آس پاس کے گرجوں میں جا کر پادریوں سے پوچھا مگر ان سب کا کہنا ہے کہ ایسا کوئی چرچ وہاں تھا ہی نہیں۔" مسز سہگل کی آواز میں حیران تھی گو ان کو یہ عجوبہ بات جان کر ایک سال کا عرصہ ہو گیا تھا۔

"اور سہگل صاحب کیا کہتے تھے اس بارے میں؟" میں نے دریافت کیا۔

"لاہور سے لوٹ کر ویر کو جب میں نے یہ بات بتلائی تو وہ کہنے لگے کہ وہ انگریز لڑکا دراصل ایک فرشتہ تھا جو ہماری مشکلات دور کرنے کے لیے ہمیں مل گیا تھا مجھے بھی ویر کی بات پر یقین آ گیا تھا مگر آپ روڈنی نورٹن سے لندن میں مل کر آئے ہیں۔" مسز سہگل نے کہا۔

جب میں مسز سہگل سے ملتے رہنے کا وعدہ کر کے تیجی کے ساتھ باہر آیا تو روڈنی سہگل ہمیں گیٹ تک چھوڑنے آیا اور کہنے لگا "میرے ممی ڈیڈی اور روڈنی نورٹن ہمیشہ ایک دوسرے کو فرشتہ سمجھتے رہے۔ کیا ہم لوگوں کا نورٹن صاحب کو خط لکھنا مناسب ہے؟"

"مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ ایک فرشتے کے کئی نام ہوتے ہیں اور کئی فرشتوں کا ایک۔ اور شاید سب انسان فرشتے بھی ہیں۔" تیجی نے کچھ اس طرح کہا کہ وہ خود فرشتوں کے وجود پر یقین رکھنا چاہتی ہے۔ ہم دونوں سہگل صاحب کے گھر سے کافی دور نکل آئے تھے۔

"تیجی اگر تم کسی دن پاکستان جاؤ اور لاہور کے قریب تمھیں وہ گرجا مل جائے جہاں نسیم اور ویر سہگل صاحب کی شادی ہوئی تھی تو تم کیا دعا مانگو گی۔" میں نے

اس سے پوچھا۔

"جناب شبیہ احمد صاحب ــــ ــــ اگر ایک محبت کرنے والے ایسے دوست کے ہاتھ میرے ہاتھوں میں آجائیں جس کو میں خود چاہتی ہوں تو دعا کے لئے اٹھانے کے لئے ہاتھ کہاں سے لاؤنگی۔" وہ مسکرا رہی تھی۔

"اور تیجی اگر بی بی مریم کو تمھیں نذرانہ دینے پڑے تو تم انھیں اپنی کون سی قیمتی چیز دوگی ؟" میں نے بھی مسکراتے ہوئے تیجی سے پوچھا۔

"وہ پانچوں اسکارف جو تم میرے لیے لندن سے لائے تھے" تیجی نے ہنستے ہوئے جواب دیا اور اپنے اڑتے ہوئے بالوں کے اطراف اس ریشمی اسکارف کو باندھنے لگی جس میں تھوڑی دیر پہلے وہ مسز سہگل کی باتیں سنکر اپنے آنسو جذب کرتی جارہی تھی۔
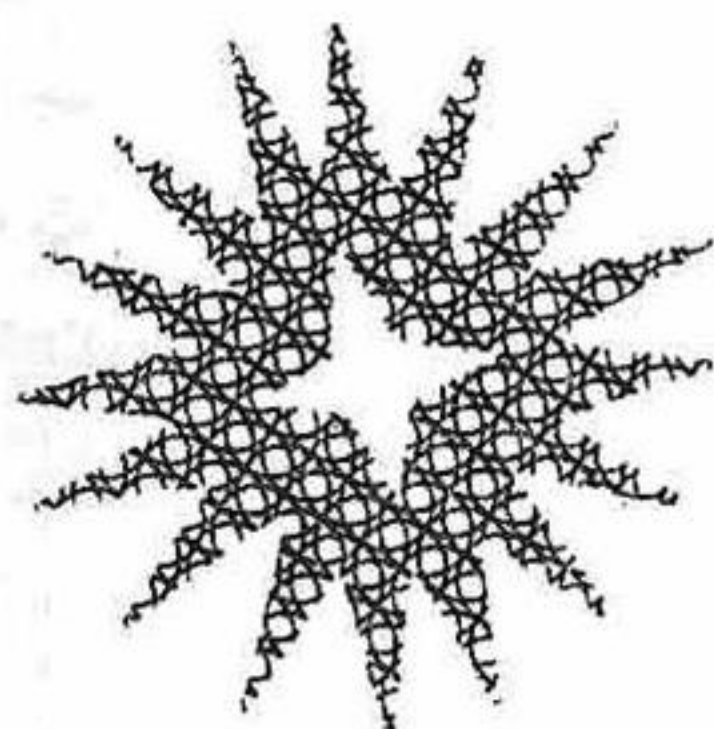
فن کار

شاہد تھوڑی دیر کے لئے یہ بالکل بھول گیا تھا کہ وہ انگلستان میں تھا اور اس مُلک کی تیز اور سرد ہواؤں سے بچنے کے لئے اُس نے اپنے سیاہ اوورکوٹ کے لمبے کالر اُونچے کر لئے تھے۔ وہ یہ بھی بھول چکا تھا کہ وہ لندن سے کچھ دُور دریائے ٹیمز کے کنارے بسے ہوئے سرسبز اور شاداب علاقے رچمنڈ کی ایک سنسان سی سڑک پر چل رہا تھا۔ شاہد کو اتنا خیال بھی نہیں تھا کہ اس کے اپنے کالے جوتوں کی سخت ایڑیاں پانی سے چمکتے ہوئے سخت پتھروں کے فٹ پاتھ پر مدّھم آوازوں کے ایک جیسے نقش بنا رہی تھیں۔ شاہد اپنے خیالوں میں کھویا ہوا لندن کے رچمنڈ سے ہزاروں میل دُور اپنے وطن بنگلور کے رچمنڈ ٹاؤن میں پہنچ چکا تھا۔ اور رہ رہ کر اس کو اپنے چچا جان کا ایک جُملہ یاد آرہا تھا جسے اُس نے اپنے لڑکپن میں سُنا تھا۔

اپنے سیدھے ہاتھ کی کلمہ کی انگلی ننھے شاہد کی طرف اٹھا کر چچا جان نے کہا تھا۔ "شاہد، یہ تھرماس تم نے توڑا ہے ؟"

"نہیں ـــــــ نہیں چچا جان"۔ شاہد نے اپنی صفائی کے لئے مونہہ کھولا تھا۔

"جھوٹ بولتے ہو شاہد، یہ تھرماس تم نے ہی توڑا ہے"۔ چچا جان کی بھاری آواز شاہد کے ذہن پر بعد میں بھی برسوں تک ہتھوڑے برساتی رہی۔

"تھرماس میں نے نہیں توڑا چچا جان، کسی اور سے ٹوٹ گیا ہوگا"۔ شاہد کی ننھی اور معصوم آواز تیزی سے برستے ہوئے لوہے کے وزنی ہتھوڑوں کی گرج میں اس طرح کھو جاتی، جس طرح بڑے میلوں میں ایسے بچّے کھو جاتے ہیں، جنہیں اپنے گھر کا پتہ یاد نہیں ہوتا۔

"تم میری کار کے سامنے آگئے!" کسی کار کے اچانک رُکنے سے اس کے پہیوں کی تیز آواز نے شاہد کو بنگلور سے انگلستان کے رچمنڈ کی ایک سرد اور سنسان سڑک پر واپس پہنچا دیا۔ کار چلانے والے نے اپنی کھڑکی کا شیشہ اُتار دیا تھا اور اس کے سیدھے ہاتھ کی پہلی اُنگلی شاہد کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

"تم مرجانا چاہتے ہو؟" انگریز ڈرائیور شاہد سے ہی مخاطب تھا۔ اس کی آواز میں چچا جان کی آواز جیسی کرختگی تو نہ تھی۔ مگر کنپٹیوں پر اس کے بال چچا جان کے بالوں کی طرح سفید ہو چلے تھے۔ آنکھوں کے گوشوں میں جھرّیاں بھی گہری ہو چلی تھیں۔

"جی ـــــــ جی ـــــــ دیکھئے وہ بات ـــــــ" بہت دیر سے شاہد انگلستان میں نہیں تھا۔ حالاں کہ سرد ہوائیں انگلستان کی تھیں، پانی سے چمکتا ہوا فٹ پاتھ انگلستان کا تھا اور سڑک کے دونوں طرف نئے گھروں کی خوش نُما قطاریں انگلستان کی تھیں۔ وطن اور بچپن کی یادوں میں شاہد کچھ اس طرح گم ہو چکا تھا کہ اب اس کے لئے انگریزی میں ایک جملہ کہنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔

"تمہیں شاید انگریزی نہیں آتی" اس حادثہ کو بچا کر شاید ڈرائیور بھی بدحواس ہو چکا تھا اور خود پر قابو پالینے کے لئے تھوڑی دیر شاہد سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ کچھ لمحوں کے لئے رُکے رہنا چاہتا تھا۔

"نہیں جناب" شاہد نے اب صاف اور شستہ انگریزی میں جواب دینا شروع کیا۔ "دراصل میں کسی گہری سوچ میں تھا۔ سڑک سنسان تھی۔ اس لئے دونوں طرف ٹریفک دیکھے بغیر اُسے پار کرنے لگا تھا۔ میں آپ سے سخت شرمندہ ہوں میری جان بچانے کے لئے شکریہ"!

"بات چیت سے تم خاصے پڑھے لکھے نوجوان لگتے ہو اور مجھے وہ لوگ پسند ہیں جو اپنی غلطی مان لیتے ہیں اور خلوص سے معافی بھی مانگ لیتے ہیں۔ اگر ویسٹ اینڈ جانا ہو تو آؤ میرے ساتھ چلو۔ میں ادھر ہی جا رہا ہوں ——— سردی کس قدر بڑھ گئی ہے۔ کار میں سفر کرو گے تو کم از کم گرمی تو ملے گی" اس انگریز کا لہجہ اب خاصا دوستانہ ہو گیا تھا۔

"چلئے، آپ کہتے ہیں تو آج میں ویسٹ اینڈ ہی چلتا ہوں۔ میں ایک عرصہ سے لندن گیا بھی نہیں۔ مگر آپ کو مجھے ساتھ لے چلنے میں تکلیف تو نہیں ہو گی، جناب؟" شاہد نے دوسری طرف سے کار کا دروازہ کھول کر سامنے کی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تکلیف ——— ؟ نہیں کوئی تکلیف نہیں۔ تقریباً روز اسی وقت، اسی راستے سے میں ویسٹ اینڈ جاتا ہوں۔ میرا گھر اسی سڑک پر ہے۔ یہ بہت سنسان اور خاموش سڑک ہے، اسی لئے میں نے یہاں گھر خریدا ہے۔ مگر لندن میں جہاں دراصل میرا کاروبار ہے، وہاں بہت شور و غل ہوتا ہے۔ سوہو لندن کا بہت مصروف علاقہ ہے۔ خود کو میں آرٹسٹ سمجھتا ہوں ——— ایک فن کار

______ مگر دنیا والے ہر کام یاب آرٹسٹ کو بزنس مین کہتے ہیں. تم مجھ سے میرے کاروبار کے بارے میں نہ پوچھنا۔ اپنے کاروبار کے سوا میں دنیا کے ہر موضوع پر بات کرنے کو تیار ہوں۔" اب وہ اپنی آرام دہ، قیمتی، لمبی چوڑی اور اندر سے گرم کار سڑک کے دونوں طرف پارک کی ہوئی کاروں کے بیچ میں سے خاصی تیز رفتاری سے چلا رہا تھا۔ کار کی رفتار کے ساتھ کار کے ڈرائیور کی باتوں میں بھی ایک روانی سی آگئی تھی۔ انسان اور مشین کے ہم آہنگ ہونے کی ایک اور کامیاب مثال.

"سڑک پار کرتے وقت تم کسی گہری سوچ میں تھے ______ کس سوچ میں تھے تم؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"کچھ نہیں ______ بس بچپن کی کچھ باتیں یاد آگئی تھیں اور میرے چچا جان کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔" شاہد، یہ تھرماس تم نے توڑا ہے۔" شاہد بے ساختہ ہنسنے لگا۔ اس نے چچا جان کے جملے کا انگریزی میں ترجمہ کر کے سنایا تھا، حالاں کہ شاہد پر الزام ہندوستانی زبان میں ہی لگایا تھا۔ اپنی آواز چچا جان کی طرح بھاری بناتے ہوئے شاہد نے اپنے سیدھے ہاتھ کی انگلی اپنے دائیں ہاتھ کی طرف بیٹھے ہوئے انگریز کی طرف اس طرح اٹھا دی جیسے وہ اس کی اپنی انگلی نہیں، پستول کی نالی تھی۔

"اچھا، اب اس ریوالور کا رخ تم میری پسلیوں سے ہٹا لو۔" شاہد کو خوش مزاجی سے ہنستے ہوئے دیکھ کر وہ انگریز بھی مسکرانے لگا۔" اور جب تم نے مجھے اپنا نام باتوں باتوں میں بتا دیا ہے شاہد تو میرا نام بھی سن لو۔ میرا نام رچرڈ موربی ہے۔"

"اوہ موربی صاحب، تو آپ کو بھی میری اس طرح اٹھی ہوئی انگلی پستول

کی نالی کی طرح دکھائی دی نہ ——— بس میرے چچا جان اسی انداز سے مجھے انگلی دکھا کر مجھ سے بات کرتے تھے اور میں چچا جان کے اس ریوالور سے گولی نکلنے کے انتظار میں سینہ تانے ان کے سامنے کھڑا رہتا تھا۔ مسٹر موربی، کتنی بار گولیاں چلتی ہیں اور آواز نہیں ہوتی۔ زخم لگتے ہیں، مگر خون بہتا ہوا نظر نہیں آتا۔ یہ سب کچھ کبھی ہوتا بھی ہے یا صرف ہمارے اندر چھپا ہوا کوئی اداکار ڈرامے کے اس المناک منظر کو کھیلنے کی خواہش میں خود کو زخمی اور لہولہان کرتا دیکھتا رہتا ہے؟" شاہد نے پوچھا۔

"میں نہیں جانتا شاہد کہ تمہارے سوال کا کیا جواب دوں؟ میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ اس سوال کا کوئی جواب ہے بھی یا نہیں! میں خود کو آرٹسٹ اس لئے نہیں کہتا کہ تمہارے ذہن میں جو سوال ہیں، ان کا جواب مجھے معلوم ہے۔ میں خود کو فن کار اس لئے کہتا ہوں کہ اپنے فن کو پرکھنے والوں کے سوچنے اور دیکھنے کے درمیانی فرق کو میں مٹا سکتا ہوں۔" رچرڈ موربی کی گرفت اس کی کار کے اسٹیرنگ وہیل پر اب سخت ہو گئی تھی۔ انگلیوں کا رنگ اور زیادہ سفید ہو گیا تھا۔

"آپ نے منع کر دیا ہے، اس لئے نہیں پوچھوں گا کہ آپ کا فن کیا ہے اور کون سا کاروبار ہے آپ کا ——— لیکن لوگوں کی سوچ پر قابو پا لینا یقیناً بہت بڑا فن ہے۔" شاہد نے خلوص کی پوری گہرائی کے ساتھ یہ تعریفی جملہ کہا۔

"میرا دل چاہتا ہے کہ کسی طرح یہ معلوم کر لوں کہ لوگ کیا سوچ رہے ہیں۔ مگر یہ کتنا مشکل کام ہے! شاید ناممکن بھی۔ میں نے تمہیں دور سے سڑک کے کنارے چلتے دیکھ لیا تھا۔ تمہیں دیکھ کر میں سمجھ گیا تھا کہ تم کسی ایشیائی ملک کے باشندے ہو۔ تمہارے کپڑے پڑھے لکھے اور معقول لوگوں کی طرح لگے۔ تم کسی گہری سوچ میں تھے۔

مگر تم کسی کار کے نیچے آکر کچل جانا نہیں چاہتے تھے، ورنہ تم کسی ایسی سڑک پر جاتے، جہاں کاریں سرپٹ اور دیوانہ وار دوڑتی ہیں اور تمہارے بارے میں ایک نظر میں اتنا سب جاننے کے باوجود تمہارے اچانک سڑک پار کرنے اور میری کار کے سامنے آجانے پر میں نے تم سے پوچھا ہی تھا کہ کیا تم مرجانا چاہتے ہو اور تم ہکلانے لگے تھے۔" رچرڈ موربی نے کہا۔ کار چلاتے ہوئے سنجیدہ باتیں کرنے کے اس سہل سے انداز سے ظاہر تھا کہ اسے لندن کے مصروف ٹریفک میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی تھی۔

"میں دراصل بھول ہی گیا تھا کہ میں انگلستان میں ہوں۔ میں اپنی بوڑھی لینڈ لیڈی کے گھر سے تھوڑی دیر پہلے ہی نکلا تھا اور بہت طیش میں تھا۔ ایک بے نام سا غصّہ تھا۔ جی چاہتا تھا کہ کہیں گولیاں چل جائیں۔ بم پھٹ جائیں، جسموں کے پرخچے اُڑ جائیں ــــــــ وہ خط جس کو پڑھ کر میرا یہ حال ہوا تھا۔ میرے وطن بنگلور سے آیا تھا۔ میری ماں نے لکھا تھا کہ میرے چچا کی طبیعت خراب ہے اور وہ مجھے اکثر یاد کرتے ہیں اور یہ جملہ پڑھ کر پتہ نہیں کہاں سے میرے دماغ میں بموں کے سے دھماکے ہونے لگے اور گولیوں کے چلنے کی آواز کے ساتھ بارود کی بو پھیل گئی ــــــــ ــــــــ اس سڑک پر جہاں آپ رہتے ہیں، میں چلتا رہا اور اپنے قدموں کی آواز میں چچاجان کا یہ جملہ مجھے لگاتار سنائی دے رہا تھا۔ شاہد، تھرماس تم نے توڑا ہے ــــــــ ــــــــ تم نے توڑا ہے ــــــــ تم نے توڑا ہے" شاہد آہستہ آہستہ خاموش ہوگیا۔

"اور شاہد ــــــــ وہ تھرماس تم نے نہیں توڑا تھا؟" رچرڈ موربی نے کار چلاتے ہوئے بہت دھیرے سے سوال کیا۔ سڑک سے اپنی نظریں ہٹا کر وہ اپنے بائیں جانب بیٹھے ہوئے ہندوستانی جوان کو دیکھنے لگا۔

"میں نے برف نکالنے کے لئے تھرماس کھولا ضرور تھا۔ مگر اس میں صرف پانی تھا اور پانی ٹھنڈا بھی نہیں تھا۔ شاید کسی نے ضرورت سے زیادہ برف بھر کر تھرماس کو زبردستی بند کر کے اس کو توڑ دیا تھا۔ مگر بے بنیاد الزام لگانے والے صفائی کب سنتے ہیں؟" شاہد کو بیس برس پہلے گزرا ہوا یہ واقعہ اچھی یاد تھا۔ جب وہ صرف آٹھ نو سال کا تھا۔ "اور مسٹر موربی، میں آج پھر اپنے چچا کی بھاری اور بے رحم آواز کو یاد کر رہا تھا اور اپنی طرف اُٹھی ہوئی اُن کی اُنگلی کی چبھن کو محسوس کر رہا تھا کہ آپ کی کار نے مجھے چونکا دیا۔ پھر کار کی کھڑکی کا شیشہ اُتار کر آپ نے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی میری طرف اُٹھا دی اور آپ کہہ رہے تھے۔ 'تم میری کار کے سامنے آگئے ـــــــ' اور مجھے سنائی دیا کہ آپ کہہ رہے تھے کہ "یہ تھرماس تم نے توڑا ہے ـــــــ"

اور شاہد نے اپنے چچا جان جیسی بھاری آواز میں رچرڈ موربی اور چچا جان دونوں کی نقل کی اور اپنے ذہن میں بنگلور کے رچمنڈ ٹاؤن اور لندن کے قریب کے رچمنڈ کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا۔

"تمہارا غصّہ تو ماں کا خط پڑھ کر شروع ہوا تھا ـــــــ کیا اور کوئی خاص بات بھی لکھی ہے، تمہاری ماں نے؟" رچرڈ موربی نے دوستوں کے سے لہجے میں پُوچھا۔

"نہیں، کچھ اور نہیں ـــــــ بس یہی کہ چچا جان بیمار ہیں اور انہیں ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا ہے۔ اور جلد ہی اُن کی اکلوتی بیٹی کی شادی کسی دولتمند تاجر سے ہونے والی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ وطن سے دوری کا احساس کبھی کبھی بہت تیز ہو جاتا ہے۔ وطن کی یاد کبھی سانپ بن کر پھنکارتی ہے تو کبھی چھری بن کر پہلو میں اُتر جاتی ہے۔" شاہد کی آواز گلوگیر ہو گئی تھی۔

" اور وطن کی یاد ہی کبھی پستول کی نالی بن جاتی ہے" رچرڈ موبی نے اسٹیرنگ وہیل سے اپنا دایاں ہاتھ ہٹا کر اُسے پستول کی شکل میں شاہد کی طرف کر دیا اور خوش مزاجی سے ہنسنے لگا۔ جان پہچان شاید دوستی کا رُوپ اُس وقت لیتی ہے جب نجی دکھ بیان کر کے دونوں فریق ایک ساتھ مسکرا یا ہنس سکتے ہیں۔

باتیں کرتے کرتے دونوں لندن پہنچ گئے تھے اور ان کی کار چوڑی ایج ویر روڈ کے نئے فلائی اوور سے اُتر کر بیکر اسٹریٹ ٹیوب اسٹیشن کے قریب آکسفورڈ سرکس کی طرف مڑنے کے لئے ٹریفک میں پھنسی تھی۔ رچرڈ موربی نے اپنے بٹوے سے ایک خوب صورت کارڈ نکال کر شاہد کو دیتے ہوئے کہا۔ " اگر شام کو تمہیں فرصت ہو تو میرے کلب آجانا۔ وہیں باتیں کریں گے۔ یہ کارڈ تم دربان کو دکھاؤ گے تو وہ سمجھ جائے گا کہ تم میرے خاص مہمان ہو اور تمہیں کلب کا ممبر بننے کے لئے کچھ نہیں کرنا پڑے گا"

" شکریہ" شاہد نے کارڈ لے کر اپنے جیکٹ کی جیب کے اندر رکھتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کے کلب ضرور آؤں گا اور میری جان بچانے کا ایک بار پھر شکریہ ——— آپ مجھے یہاں کہیں بھی اُتار دیجئے"

رچرڈ موربی نے آکسفورڈ سرکس گزر جانے کے بعد کار ریجنٹ اسٹریٹ میں احتیاط سے روک دی۔ کار سے اترتے ہی شاہد کو اندازہ ہوا کہ سردی کس قدر بڑھ گئی تھی۔ گو شام کے چار ہی بجے تھے۔ مگر روشنی دھندلا چکی تھی۔ شاہد نے سوچا کہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد ان سڑکوں پر بے شمار مرد اور عورتیں، لڑکے اور لڑکیاں اپنے اپنے دفتروں سے نکل کر گھر لوٹنے کی پاگل دوڑ میں شریک ہو جائیں گے۔ شاہد نے یہ بھی سوچا کہ آج وہ ان بڑی بڑی شاندار سڑکوں اور ان کے پیچھے چھپی ہوئی ایک دوسرے سے آنکھ مچولی کرتی ہوئی، پتلی، تنگ اور بل کھاتی ہوئی خوب صورت گلیوں میں خوب

گھومے گا اور اپنے چچا کا خیال بھی اپنے دل میں نہ لائے گا۔ وہ اپنی چچا زاد بہن طاہرہ کو بھی یاد نہ کرے گا جس کی شادی کسی امیر آدمی سے ہونے والی تھی ——— طاہرہ جس کے بال بہت کالے اور بہت لمبے تھے اور جس کی آنکھیں بہت ہمدرد تھیں۔ شام ڈھلنے پر وہ اپنے معزز اور مہذب انگریز دوست، مسٹر رچرڈ موربی کے کلب جائے گا۔ شاہد کو لندن آئے ہوئے دو سال ہو گئے تھے۔ مگر وہ کسی کلب کا ممبر نہیں بنا تھا۔ انگریزوں سے دوستی بڑھانے کے لئے کسی کلب کا ممبر بننا پڑتا ہے یا اتوار کی صبح کو کسی گرجا میں عبادت کے لئے جانا ضروری ہے۔ ملاقات کے لئے کوئی نہ کوئی بہانہ چاہیئے۔ اپنے ساتھ کام کرنے والوں کو انگریز مشکل سے ہی دوست بناتے ہیں۔

لندن کے سب سے بڑے شاپنگ سینٹر میں بڑھتی ہوئی سردی میں گھومتے ہوئے نہ جانے کیوں شاہد کو بار بار بنگلور یاد آ رہا تھا ——— گل مہر کے اونچے اونچے درخت اور ان کی پھیلی ہوئی شاخوں پر نارنجی اور سرخ پھولوں کی آگ اور جیکارانڈا کے مضبوط تنیوں والے درخت اور ان کے نازک کاسنی پھولوں کے گچھے اور دوسرے کالے کالے سے اونچے اونچے پیڑ جن کی گھنی چھاؤں میں سبز بیلیں پروان چڑھتی ہیں اور شام کے جھٹ پٹے میں آسمان میں کم ہوتی ہوئی روشنی کا مرثیہ پڑھتے بے شمار خوش آواز پرندے اور وہیں اسی شہر میں کسی ہسپتال کے سفید اونچے لوہے کے پلنگ پر لیٹے ہوئے اس کے چچا جان آکسفورڈ سرکس کے قریب ایک دوکان میں سجے ہوئے کٹ گلاس کے سامان کو غور سے دیکھتے ہوئے شاہد نے سوچا کہ چچا جان اس وقت بھی ضرور کسی نہ کسی ڈاکٹر یا نرس پر کوئی نہ کوئی بے بنیاد الزام لگا رہے ہوں گے۔ شاہد کو اچانک ایک جھرجھری سی آئی جو سرد

ہواؤں کے گدگدانے سے پیدا ہونے والی کپکپی نہ تھی، بلکہ ایک بے نام حقارت کا احساس تھا، جو وقت اور فاصلے کی خلیجیں درمیان میں آجانے کے باوجود شدید تھا، تکلیف دہ تھا، ہم قائم تھا۔

روشنیاں جلے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی جب شاہد اِدھر اُدھر ٹہلتا ہوا ڈین اسٹریٹ کے ساتھ مارگریٹ چرچ کے سامنے واقع وینس کلب کے دروازے پر پہنچا۔ کلب کا دربان چھ فٹ اُونچا کوئی بیس اکیس برس کا صحت مند لڑکا تھا۔ اُس نے گہرے نیلے رنگ کا اوور کوٹ پہن رکھا تھا، جس کی آستینوں اور کالر پر سنہری پٹیاں لگی تھیں۔ نیلے ہی رنگ کا اُونچا سنہری پٹیوں سے سجا ہوا ہیٹ اس کے سر پر تھا۔

کلب کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے شاہد کو دیکھ کر دربان نے شاہد سے پُوچھا۔

"کیا آپ ہمارے کلب کے ممبر ہیں جناب؟"

دربان کا لہجہ مؤدّب مگر کاروباری تھا۔ بار بار یہ سوال اجنبیوں سے پُوچھتے پُوچھتے شاید اس کو اپنے سوال کا جواب سُننے کی خواہش بھی باقی نہیں رہی تھی۔

"نہیں، میں ممبر نہیں ہوں۔" شاہد نے کسی قدر سہم کر جواب دیا۔

"تو آپ صرف پانچ پاؤنڈ دے کر اس کلب کے ممبر بن جائیے ——— اندر داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ پر ہمارا خزانچی بیٹھا ہوا ہے وہ آپ سے یہ رقم لے کر ممبر شپ کارڈ دے دے گا۔" دربان کا یہ مشورہ بھی اس کے سوال کی طرح کاروباری انداز میں دیا گیا تھا۔

کلب کے اندر داخل ہوتے ہی شاہد نے معمر خزانچی کو رچرڈ موربی کا دیا ہوا

کارڈ دکھایا۔

"آپ ہمارے مالک کے خاص مہمان ہیں۔ آپ کو کلب کے ممبر بننے کی ضرورت نہیں۔" خزانچی نے اپنی سیٹ سے اٹھتے ہوئے نہایت ادب سے کہا۔ اپنا اوورکوٹ آپ وہاں سامنے کاؤنٹر پر روزی کے پاس رکھوا دیجئے۔ میں مالک کو اطلاع کرائے دیتا ہوں کہ آپ تشریف لے آئے ہیں۔

شاہد کی آنکھیں تھوڑی ہی دیر میں کلب کے اندر چھائی ہوئی نیم تاریکی کی عادی سی ہو چلی تھیں۔ کالے کالے سُوٹ پہنے ایک طرف سازندے اپنے اپنے ساز ٹھیک کر رہے تھے اور سرخ، ارغوانی، ہری، پیلی، نیلی اور بیگنی روشنی کے چھوٹے بڑے دائرے جیسے کلب کے دیواروں، چھت اور ہال میں بچھی ہوئی میز کرسیوں کے درمیان شریر بچوں کی طرح ایک دوسرے کے پیچھے دَوڑ رہے تھے۔

"کیا میں آپ کا کوٹ لے سکتی ہوں؟" روزی کی سرگوشی نے شاہد کو جیسے چَونکا دیا۔ اس نے دیکھا کہ لمبے سنہرے بالوں والی روزی دراز قد کی ایک بہت خوب صورت لڑکی تھی۔ اپنی ماں کا خط پڑھنے کے بعد شاہد کا دل کسی بے نام اُلجھن کی وجہ سے لندن کے اوپر چھائے ہوئے گیلے گیلے بادلوں کی طرح بھاری سا ہو چکا تھا۔ مگر پہلے رچرڈ موربی کی گفتگو نے اور اب وینس کلب کے ماحول نے شاہد کی اُس وقتی بد مزاجی کو کم کر دیا تھا جو کبھی کبھی اندرونی اُلجھن کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے۔ شاہد نے جب روزی کو خود سے ہم کلام پایا تو اُسے محسوس ہوا کہ لندن کی قدیم اور سیاہی مائل عمارتوں کے اوپر سے بادل چھٹنے لگے تھے۔

"آپ نے مجھ سے صرف میرا کوٹ مانگا ہے، اگر آج اور کچھ بھی مانگ لیتیں تو شاید میں انکار نہ کرتا۔" شاہد نے روزی کی آنکھوں کے نیلے آئینوں میں دیکھتے ہوئے

اپنا اوورکوٹ اُتارتے ہوئے اس سے آہستہ سے کہا۔
"معاف کیجئے، میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی"۔ روزی نے کوٹ لے کر قدرے مسکراتے ہوئے کہا
"آپ سمجھتیں بھی کیسے؟" میں اپنی زبان میں یہ باتیں کہہ رہا تھا، انگریزی میں نہیں"۔ شاہد نے جھینپتے ہوئے جواب دیا اور اس کا جی چاہا کہ روزی سے کہہ دے کہ آج صبح سے، اپنی ماں کا خط پڑھنے کے بعد سے، وہ بار بار اپنے وطن بنگلور لوٹتا رہا ہے۔ اور آج صبح سے اس کا جی چاہتا رہا ہے کہ وہ کسی کندھے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دے، بالکل چھوٹا سا بچّہ بن جائے، اپنے جذبات کا بے جھجک اظہار کر دے۔
"اچھّا ہوا تم آ گئے شاہد ——— میں ڈرتا تھا کہ کہیں تم دروازے سے ہی نہ لوٹ جاؤ۔ ممبر شِپ فیس تو نہیں دی نا؟ یہاں تم کچھ خرچ نہ کرنا۔ یہ خوب صورت خوب صورت لڑکیاں یہاں صرف اس لئے رکھی گئی ہیں کہ ممبروں سے پیسے خرچ کرائیں۔ تم ممبر نہیں، میرے دوست ہو اور میں یہ راز جانتا ہوں کہ تھرماس تم نے نہیں توڑا تھا"۔ مسٹر موربی کی باتیں سُن کر شاہد ہنسنے لگا اور شاہد کو ہنستا دیکھ کر رچرڈ موربی بھی خوش دِلی سے ہنس دیا۔ "لو یہ تمہاری میز ہے۔ جب تک تمہارا دل چاہے، یہاں بیٹھنا ——— شیمپین پیو گے؟"
"میں آج تک کسی ایسی جگہ گیا ہی نہیں کہ شیمپین چکھ سکتا"۔ شاہد نے اپنے انگریز مہمان سے گنواروں جیسی سادگی کے ساتھ سچی بات کہہ دی۔ اپنے چچا کی محبّت سے محروم شاہد کا جی چاہ رہا تھا کہ رچرڈ موربی سے دوستی کر لے۔ پُر خلوص دوستی، راز و نیاز والی دوستی۔
"ہمارے کلب میں جو شراب دس گنا قیمت پر شیمپین کے نام پر بیچی جاتی

ہے، وہ بالکل ہی واہیات ہوتی ہے۔ جھاگ دار سستی شراب۔ مگر میں تمہیں اصلی فرانسیسی شیمپین پلاؤں گا ــــــــ ہیلن!" رچرڈ موربی نے قریب سے گزرتی ہوئی لڑکی کو پکارا ــــــ

ہیلن سُرخ لباس پہنے ہوئے اپنے حسن سے مطمئن نظر آتی تھی۔ وہ قریب آگئی

"دیکھو، ہیلن، یہ میرے خاص مہمان ہیں۔ ان کا تم خیال رکھنا۔ اچھی شیمپین پلانا۔ وہ جو بہت ٹھنڈی ہو گئی ہو ــــــ ان کو آج اپنے وطن کی یاد بہت ستا رہی ہے۔ ان کو زیادہ جذباتی نہ بننے دینا اور یاد رہے کہ ان کے پیسے نہ خرچ ہوں۔" پھر رچرڈ موربی شاہد کی طرف مڑتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔" لو، اب میں چلتا ہوں۔ بہت کام کرنا ہے۔ تمہیں بیچ میں آکر دیکھتا بھی رہوں گا۔ تم اب موج اڑاؤ اور آج رات پستول کی نالی کو بالکل بھول جاؤ۔"

"آج آپ کیا پہلی بار اس کلب آئے ہیں؟" ہیلن نے اپنی کُرسی شاہد کی کرسی کے پاس سرکاتے ہوئے پُوچھا۔ رچرڈ موربی نے شاید خود شراب کا آرڈر دے دیا تھا کیوں کہ تھوڑی ہی دیر میں ایک نوعمر لڑکی چاندی کی بالٹی میں برف کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے ڈھکی ہوئی ایک سبز بوتل اور دو نہایت نازک اور مخصوص وضع کے گلاس لے آئی تھی۔

"جی ہاں، آج پہلی بار اس کلب میں آیا ہوں۔ اس کلب میں کیا ہوتا ہے؟" شاہد نے سادگی سے پُوچھا!

"لندن کے اس علاقے سوہو میں اس طرح کے کلب قدم قدم پر ہیں۔ یہاں ہم جیسی کم عمر اور خوش شکل لڑکیاں نوکر رکھی جاتی ہیں تاکہ مہمانوں سے زیادہ سے زیادہ خرچ کرائیں۔ یہاں آنے والے زیادہ تر امیر مرد ہوتے ہیں۔ ہلکی ہلکی پسندیدہ

دُھنوں پر رقص ہوتا ہے۔ جب کلب بھر جاتا ہے تو کیبرے ہوتا ہے اور اسٹرپ ٹیز۔"
ہیلن نے شیمپین کو ٹھنڈا ہونے دیا اور سوچنے لگی کہ آج اس کو بھی اچھی شراب ملے گی۔
ہیلن کو کلب میں شاہد کی طرح معصوم اور نوجوان ممبر کبھی نہیں ملا تھا، اس لئے وہ
شاہد سے باتیں کر کے خوش ہو رہی تھی اور پھر اس کے مالک کا حکم بھی یہی تھا کہ وہ
اس ہندوستانی نوجوان کا دل بہلائے۔ ساری شام اجنبی، ادھیڑ عمر، حد سے زیادہ
بے تاب مردوں کے ساتھ رقص کر کے اپنی ایڑیاں دُکھانے کی بجائے ایک میز پر بیٹھ
کر ٹھنڈی ٹھنڈی شیمپین پینا اور ہلکی پھُلکی باتیں کرنا کس قدر فرحت بخش کام
ہے ــــــ ہیلن یہ سب کچھ سوچ کر مسکرانے لگی۔ پر خلوص مسکراہٹ آنکھوں
کی روشنی میں گھل جاتی ہے۔ شہد بن جاتی ہے۔

"اسٹرپ ٹیز؟" شاہد نے حد سے زیادہ تعجب کے لہجے میں سوال کیا۔

"جی ہاں اسٹرپ ٹیز ــــــ تیز تیز موسیقی پر ایک ایک کر کے کپڑے
اُتارنا اور بالکل برہنہ ہو جانا ــــــ" ہیلن اب اوپر کی طرف کھلے ہوئے گلاسوں
میں شیمپین اُنڈیلنے لگی تھی اور ٹھنڈی شراب سے چھوٹے چھوٹے بُلبُلے اُٹھ رہے تھے۔
سبز بوتل کے مونہہ سے سفید دُھواں نکل رہا تھا۔ "آپ یہ نہ سمجھئے گا کہ مردوں سے
بھرے کمرے میں کسی لڑکی کا سارے کپڑے اتارنا کوئی آسان کام ہے۔ بعض لڑکیاں
تو اسٹیج پر آنے سے پہلے ہی نروس ہو کر بھاگ جاتی ہیں۔"

"تو کیا تم بھی کپڑے اُتارتی ہو، ہیلن؟" شاہد نے اس کے تنگ سُرخ لباس کو
دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ شاہد کو ڈر تھا کہ اگر ہیلن 'ہاں' کہے گی تو وہ خود بہت شرما
جائے گا۔

"نہیں، میں اسٹرپ نہیں کرتی۔ میرا کام مہمانوں سے باتیں کرنا یا ان کے

ساتھ رقص کرنا ہے۔ مگر وہ روزی ہے نا؟" ——— ہیلن نے اس کاؤنٹر کی طرف اشارہ کیا، جہاں شاہد نے اپنا اوورکوٹ رکھوایا تھا اور روزی سے انگریزی کی بجائے ہندوستانی میں باتیں کرنے لگا تھا۔" اُس لڑکی نے ایک رات اسٹرپ کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اپنے لباس کے بٹن کھولنے کے لئے جب وہ ہاتھ اپنے کندھے تک لے گئی تو کانپنے لگی۔ اس کا جسم پسینے سے بھیگ گیا اور اس کے دونوں بازو شل ہوکر بھاری پتھر کی طرح نیچے گر پڑے ——— چیرز!" ہیلن اور شاہد نے اپنے اپنے جام اُٹھائے، ایک دوسرے کی آنکھوں میں چند لمحے کے لئے دیکھا اور شراب کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ پینے لگے۔

کافی دیر تک شاہد کلب کا جائزہ لیتا رہا اور شیمپین کی میٹھی سی، گدگداتی ہوئی ٹھنڈک کو آہستہ آہستہ اپنے حلق سے نیچے اترتے ہوئے محسوس کرتا رہا۔

"کیا آپ ناچیں گے نہیں"، ہیلن نے شاہد سے پوچھا۔ کیوں کہ اب والز کی مستی بھری دُھن کلب میں ہر طرف پھیلنے لگی تھی اور کئی جوڑے فرش پر قدم سے قدم اور جسم سے جسم ملانے لگے تھے تاہم موسیقی اتنی اونچی نہ تھی کہ بات چیت جاری نہ رہ سکے۔

"یہ لڑکیاں جو آپ کے کلب کے مہمانوں کے ساتھ ناچ رہی ہیں، کیا ان میں سے کوئی اسٹرپ کرتی ہے؟" شاہد نے ہیلن کی دی ہوئی ناچنے کی دعوت کو نظرانداز کرتے ہوتے اپنے بائیں شانے سے پرے اس کاؤنٹر کی طرف دیکھا، جہاں رچرڈ موربی اور روزی باتیں کرتے ہوئے ایک نپی تلی بے تکلفی کے انداز سے ہنس رہے تھے۔

"نہیں، ہمارے کلب میں اسٹرپ اور کیبرے کرنے والی لڑکیوں کو آرٹسٹ

کہا جاتا ہے اور انہیں مہمانوں سے ملنے جلنے کی اجازت نہیں ہے سوہو میں بہت سے کلب ہیں، جہاں لڑکیاں اپنے ایکٹ سے پہلے اور بعد میں تماش بینوں کے پاس جاکر بیٹھتی ہیں ہنسی مذاق کرتی ہیں، ناچتی ہیں، مگر ہمارے کلب میں اس کی اجازت نہیں ——— مالک کا کہنا ہے کہ آرٹ دیکھنے والے کی آرٹسٹ سے اتنی زیادہ قربت نہیں ہونی چاہیئے۔ ایکٹ دیکھتے وقت تماشائیوں کو یہ محسوس ہونا چاہیئے کہ یہ لڑکی جو کپڑے اتار چکی ہے، کوئی گم نام سی لڑکی ہے، جو کسی گم نام سے محلّے کے کسی گم نام سے گھر میں رہتی ہے۔" ہیلن یہ کہتے ہوئے جھک کر چاندی کی ٹھنڈی بالٹی سے شیمپین کی سبز بوتل کے بوجھ کو اپنے نرم ہاتھ میں تولنے لگی۔

جب موسیقی بند ہوئی اور جوڑے اپنی اپنی میزوں کی طرف لوٹنے لگے تو کالا سوٹ اور کالی بو ٹائی پہنے ہوئے ایک اونچے قد کا نوجوان مائیکروفون کو اپنے مونہہ کے قریب دونوں ہاتھوں سے پکڑے کہہ رہا تھا۔ "بہت ہی معزز خواتین اور حضرات ——— وینس کلب آپ کا پھر ایک بار دل سے استقبال کرتا ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں ہمارے کلب کی مشہور آرٹسٹ آپ کے لیے حد اصرار پر اپنا ایکٹ پیش کریں گی۔ حاضرین! اس سوہو میں بہت سے کلب ہیں، جہاں اسٹرپ دیکھا جاسکتا ہے۔ مگر ایک کلب بھی ایسا نہیں، جہاں ریٹا جیسی حسین آرٹسٹ ہو ——— حضرات! اپنی سانسیں روک لیجیئے اور ریٹا کا تالیوں سے استقبال کیجیئے ——— لندن کی مشہور آرٹسٹ ریٹا!"

موسیقی اچانک بہت اونچی آواز سے بجنے لگی۔ تماش بین زور زور سے تالیاں بجانے لگے اور رنگین روشنیوں کے چھوٹے بڑے دائروں کی متحرک روشنی میں چلتی ہوئی ریٹا اپنے خوب صورت اور سڈول جسم کو سنبھالے سازندوں کے قریب

آکر کھڑی ہو گئی۔

"کیبرے اور اسٹرپ میں دراصل آرٹسٹ کا کمال ہوتا ہے۔ پورے کپڑے پہنے ہوئے تو کوئی بھی لڑکی شریف نظر آسکتی ہے۔ مگر مالک کا کہنا ہے کہ سارے کپڑے اُتارنے کے بعد معصوم نظر آنا اور معصومیت کو قائم رکھنا بہت بڑا فن ہے۔ مگر آرٹسٹ کی فن کارانہ صلاحیتوں کے ساتھ اچھے سُروں میں بجتی ہوئی اس موسیقی اور مائیکروفون سے نئے نئے انداز سے ایکٹ کا تعارف کرانے کا بھی کامیابی میں بڑا حصّہ ہے ـــــــــــ" گلاس کو بار بار میز سے اٹھاتے ہوئے اپنے سُرخ ہونٹوں سے چھُوتے ہوئے ہیلن نے یہ سب باتیں شاہد سے پُرانے دوستوں کے انداز میں کہی تھیں۔

شاہد بہت شرماتے ہوئے ریٹا کو پہلے کنکھیوں سے اور پھر بے جھجک دیکھتا رہا ـــــــــــ ریٹا اِدھر اُدھر ٹہلتی رہی اور تیز روشنی کے دائرے اس کا پیچھا کرتے رہے اور موسیقی کی اُونچی تان پر ریٹا اپنے جسم سے لباس کو کم کرتی گئی۔ جیسے خزاں میں پیڑوں سے پتّے آہستہ آہستہ، بغیر کسی آواز کے گرتے جاتے ہیں۔ شاہد کو محسوس ہوا جیسے اس کے پپوٹے گرم ہو گئے تھے۔ اس نے ہیلن سے پُوچھا۔ "کیا ریٹا نے اپنے کندھے پر روغن مل رکھا ہے؟ کتنا چمک دار ہے!" ریٹا کو اچانک بالکل برہنہ دیکھ کر دراصل وہ خود بہت جھینپ رہا تھا۔ تالیوں کی گونج میں ریٹا نے فرش سے اپنے بکھرے ہوئے سب کپڑے تیزی سے اٹھائے اور دبیز پردوں کے پیچھے چلی گئی۔

"مسٹر موربی کا کہنا ہے کہ جسم کی اس طرح نمائش کرنا کہ خود کو ننگے ہو جانے کا احساس نہ ہو، بہت بڑا فن ہے۔ کپڑے اس طرح اُتارنا کہ فحش نہ لگے، بہت

محنت کا کام ہے۔ ریٹا کا پورا جسم پسینے سے بھیگ رہا تھا، اسی لئے چمک رہا تھا۔ اس بے چاری کو ہر شام سب سے پہلے اپنا ایکٹ دکھانا پڑتا ہے۔" ہیلن نے شیمپین کی چُسکی لیتے ہوئے کہا۔

"لیکن میرے خیال میں تم اپنے مالک کو بہت چاہتی ہو۔" شاہد نے ہیلن کی آنکھوں کی نیلاہٹ میں اپنے پیچھے جلتی ہوئی روشنی کی چمک دیکھتے ہوئے بہت آہستہ سے کہا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟ کیا مسٹر موربی نے تم سے کچھ کہا ہے؟" ہیلن کے صحت مند رُخساروں پر جیسے اس کے لباس کا سُرخ رنگ اچانک چڑھ گیا تھا اور اس نے اپنی گہری سیاہ پلکیں جھکالی تھیں۔ اور جھکی ہوئی پُتلیوں کے پیچھے نیلی پُتلیوں کا رقص جیسے تھم گیا تھا۔

"یہ بات بالکل سچ ہے کہ میں جھوٹ نہیں بولتا۔ اس لئے تمہارے سوال کا جواب نہیں دوں گا۔ مگر کیا رچرڈ موربی بھی تمہیں چاہتے ہیں؟" شاہد نے جیسے کلب کے شور شرابے سے بلند ہیلن کے دل کی نازک اور تیز دھڑکنیں سُن لی تھیں۔ اس کی نگاہیں ہر طرف اپنے میزبان کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

دھیمی دھیمی موسیقی پھر بجنے لگی تھی۔ کچھ لوگ دوبارہ ناچنے لگے تھے۔ ناچ کے بہانے جسموں کے فاصلے آسانی سے کم ہو جاتے ہیں۔

"کاش وہ مجھ سے محبّت کرتے ــــــــ کتنے برسوں سے میں اُن کے التفات کی منتظر ہوں۔ میں بریڈ فورڈ سے اپنے گھر سے نکل کر سیدھی اس کلب میں اسٹرپ ٹیز آرٹسٹ بننے آئی تھی اور میں نے پہلے ہی دن مسٹر موربی کو پسند کر لیا تھا ــــــــ ان کی آنکھوں میں بھوک نہ تھی۔ پہلے دن انٹرویو لیتے وقت اُنھوں نے مجھ سے کپڑے اُتارنے کے لئے کہا تھا اور میں جھجک گئی تھی، ڈر گئی تھی اور

جب میں نے پورے کپڑے اُتار ڈالے تو انہوں نے مجھے آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھ، حالانکہ اپنے اسکول اور محلّے میں سب سے سڈول جسم شاید میرا ہی تھا۔" ہیلن کی آواز میں اُداسی بھری ہوئی تھی۔

"میرے خیال میں تو ہیلن، تم بہت ہی خوب صورت لڑکی ہو۔ مگر جب تم کپڑے اُتار چکیں تو رچرڈ موربی نے تمہیں کیوں نہ دیکھا؟"

شاہد نے ہیلن کے شانوں پر لٹکے ہوئے گھنے بالوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں جانتی ہوں کہ میں خوب صورت ہوں۔" ہیلن نے شراب کا گلاس اٹھا کر واپس میز پر رکھ دیا۔ اور سگریٹ سُلگا لیا۔ "مگر مالک کا کہنا ہے کہ آرٹسٹ بننے کے لئے صرف خوب صورتی کافی نہیں ہوتی ——— دیکھنے والے کو کچھ ایسا محسوس ہونا چاہیئے جیسے وہ بغیر اطلاع کسی ایسی لڑکی کے کمرے میں داخل ہو گیا ہے جو سب سے بے خبر ہے۔ لڑکی تنہائی میں کپڑے اُتارے یا غیر مردوں سے بھرے کلب میں، اس کو کپڑے اُتارتے وقت اپنے دونوں بازو اور اپنا سر بہ یک وقت اپنے لباس میں نہیں پھنسانا چاہیئے کیوں کہ اس طرح بہت مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے۔" ہیلن نے کہا۔

"اور ہیلن تم نے پہلے ہی دن اپنے سر اور بازو دونوں کو اپنے لباس میں پھنسا دیا تھا؟" شاہد نے پوچھا۔

"ہاں۔" ہیلن کی آواز ایک دم کچھ زیادہ بھرّا گئی۔ اور آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو ڈبڈبانے لگے۔ وہ اپنے چھوٹے سے ہینڈ بیگ میں رومال ڈھونڈنے لگی۔

"کیا شیمپین ختم ہو گئی ہے کہ ہیلن آنسوؤں سے اپنے گلاس بھر رہی ہے؟" رچرڈ موربی نے اچانک کہیں سے دبے پاؤں آکر ان دونوں سے پوچھا۔

"سگریٹ کا دھواں میری آنکھوں میں چلا گیا تھا۔" ہیلن نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے سنگ دل محبوب کو دیکھا اور شاہد نے محسوس کیا کہ محبت جب آنسو بنتی ہے تو آنکھیں کس قدر حسین ہو جاتی ہیں۔ آنسوؤں کو روک کر مسکرانا کتنی جان لیوا ادا بن جاتی ہے۔ ان قاتل اداؤں سے بے نیاز رہنا ناممکن ہے۔

"میں نے آج پہلی بار اسٹرپ ٹیز کا فن دیکھا ہے۔ اور ریٹا مجھے بہت اچھی آرٹسٹ لگی ہے۔ اس میں شرم و حیا جیسے کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔" شاہد اپنے میزبان کا دل خوش کرنے کے لئے یہ کہہ گیا تھا ورنہ وہ جانتا تھا کہ وہ خود ایسے ماحول سے آیا تھا جہاں بغیر برقعے والی عورت کو سڑک پر چلتے دیکھ کر لوگ بے حیا کہہ دیتے ہیں اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ہیلن کی موجودگی کی وجہ سے وہ ریٹا کی برہنگی کو ٹھیک طور سے دیکھ بھی نہ سکا تھا۔

"مجھے اپنے کلب اور آرٹسٹوں پر ناز ہے۔ کپڑے اُتارنے میں کچھ چھچھورا پن آ جائے تو ممبر شکایت کرنے لگتے ہیں۔ شرم و حیا کپڑوں میں نہیں، آنکھوں میں ہوتی ہے۔ اب جو آرٹسٹ اپنے فن کا مظاہرہ کرے گی، وہ ہمارے کلب ہی کی نہیں، بلکہ پورے لندن کی بہترین آرٹسٹ ہے۔ تم اس کی آنکھوں کو دیکھتے رہنا۔" رچرڈ موربی نے شاہد سے کہا۔

باری باری مائیکروفون کو اپنے دونوں ہاتھوں میں اُچھالتے ہوئے اب کالا سوٹ پہنے وہ دراز قد خوش شکل نوجوان پھر روشنی میں نہایا ہوا سب کے سامنے کھڑا تھا۔ اب اس کی کلف لگی قمیض ضرورت سے زیادہ سفید نظر آ رہی تھی۔ ساز آہستہ آہستہ بج رہا تھا۔ "معزز حاضرین! اب آپ کے سامنے پیش ہے ہمارے کلب کی حسین، نو عمر، شگوفہ دہن، قیامت ڈھانے والی حسینہ ــــــــــ

مارگریٹ! خواتین اور حضرات، مارگریٹ۔ کے فن کو دیکھنے کے لئے دُور دُور کے مُلکوں سے لوگ لندن آتے ہیں ——— مجھے ہر شام اس کلب کی طرف آتے ہوئے یہی بات خوش کر دیتی ہے کہ مارگریٹ کے فن کا مظاہرہ ایک بار پھر دیکھ سکوں گا ——— حضرات اور خواتین، زور زور سے تالیاں بجا کر اس کم عمر حسینہ کا استقبال کیجئے۔"

پورا کلب تالیوں سے گُونجنے لگا۔ ہیلن کے ساتھ خود تالی بجاتے ہوئے شاہد نے مُڑ کر رچرڈ مور بی کو دیکھا جو قریب ہی کھڑے ہوئے بہت زور سے تالیاں بجا رہے تھے۔ موسیقی کی ڈوبی ہوئی آوازیں پھر تیز ہو گئیں۔ ہر رنگ کی روشنی کے دائرے دیواروں، چھت اور تماش بینوں پر ناچتے ہوئے سازندوں کے قریب رکھی ہوئی ایک اُونچے اسٹول پر آ کر جمع ہو گئے اور سب لوگوں کی طرح شاہد نے بھی دیکھا کہ کالے، چمکیلے چمڑے کا تنگ کوٹ اور کالے چمڑے کی تنگ پتلون پہنے، بڑے چھجے کا کالا ہیٹ لگائے مارگریٹ اسٹول پر آ کر اس طرح بیٹھ جیسے امریکی فلموں میں کاؤ بوائے شراب خانے میں آ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ مارگریٹ کے لپ اسٹک لگے سُرخ ہونٹوں میں دبا ہوا جلتا ہوا سگریٹ اچانک نیچے گر گیا۔ اور شاہد کا دل چاہا کہ فرش سے سگریٹ اُٹھا کر مارگریٹ کو دے دے۔ وہ اپنی کرسی سے اُٹھا بھی مگر ہیلن نے ہاتھ پکڑ کر اُسے روک دیا۔ شاہد کی طرح کئی اور مرد بھی اپنی کرسیوں پر واپس بٹھا دئے گئے۔ پھر موسیقی اُونچی اُٹھتی گئی اور ساتھ ہی دیکھنے والوں کے دلوں کی رفتار تیز ہوتی رہی۔ روشنی کے حلقے ایک لمحے کے لئے مارگریٹ کے جسم سے سرک کر اُونچی آواز کی موسیقی کے ساتھ جب واپس اسی پر آ کر رُکتے تو مارگریٹ کے سیاہ لباس کا کوئی اور حصّہ اسٹول کے قریب فرش پر گرتا ہوا ——— نیچے فرش پر مارگریٹ کا ہیٹ تھا اور

پھر اس کا سُرخ اسکارف تھا، جسے مارگریٹ نے گلے سے کھول کر ڈالا تھا۔ اسکارف پر پہلے ایک دستانہ اور پھر دوسرا آکر گرے اور پھر موسیقی کی دھمک اُونچی ہوئی تو کلب میں بیٹھے سب ہی لوگوں نے دیکھا کہ مارگریٹ نے اپنے تنگ کوٹ کا زِپ پھرتی سے کھول کر کوٹ اتار دیا تھا اور اپنے ننگے بازو ہوا میں اُٹھا کر وہ اپنے رُوکھے بالوں کو اِدھر اُدھر جھٹک رہی تھی۔ مارگریٹ کے سفید شانے چکنے تھے۔ اور اس کی بغلیں بہت خوب صورتی سے اندر کی طرف دھنسی ہوئی تھیں اور جب مارگریٹ نے اپنے سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی سے اپنے بائیں بازو کو سہلایا تو شاہد کو ایسا محسوس ہوا جیسے خود اس کی انگلیاں ایک انوکھی، گلابی مخمل کو چھُو رہی تھیں۔

سب لوگ دَم سادھے بیٹھے تھے۔ کھچا کھچ بھرے ہوئے کلب میں کوئی کھانس تک نہیں رہا تھا۔ ہیلن کی انگلیوں میں جلتا ہوا سگریٹ دبا ہوا تھا، جس کی راکھ لمبی ہوگئی تھی اور ہیلن نے شاید اس خیال سے راکھ کو جھاڑا نہیں تھا کہ مارگریٹ کا ایکٹ دیکھنے میں خلل پڑ جائے گا۔ شراب گلاسوں میں پڑی لاوارث لگ رہی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کلب میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو یقین ہوگیا تھا کہ اس کلب کی پوری بلڈنگ کسی کچّے دھاگے سے باندھ کر ہوا میں لٹکا دی گئی تھی اور ذرا سی ہنسی، ذرا سی آواز، کرسی کھسکنے کی ہلکی سی آہٹ اس دھاگے کو توڑ سکتی تھی اور مارگریٹ کا فن دیکھنے والوں کو شاید اپنی جان بہت پیاری ہوگئی تھی، اس لئے وہ بے جان موم کے پُتلوں کی طرح کھڑے یا بیٹھے تھے۔

سازوں کی آواز دبتی اور پھر ابھرتی اور پھر اُونچی آواز کے ساتھ مارگریٹ کے خوب صورت جسم سے کپڑے اترتے جاتے اور اسٹول کے قریب ان کا ڈھیر اُونچا ہوتا جاتا اور جب وہ بالکل برہنہ ہوگئی تو شاہد نے دیکھا کہ اس کی

نیلی آنکھیں جیسے کسی بہت ہی مشکل سوال کا حل ڈھونڈنے کے لئے خلا میں کہیں الجھ کر رہ گئی ہیں، ان کھوئی ہوئی نظروں میں کچھ عجیب سا دل کو موہ لینے والا اثر تھا۔ پھر جب مارگریٹ نے اپنی آنکھیں بند کیں تو تماش بینوں کو پتہ چلا کہ ایکٹ ختم ہو گیا ہے اور اسٹول پر بیٹھی ہوئی حسینہ کوئی یونانی مجسمہ نہیں، لندن کی مشہور اسٹرپ ٹیز آرٹسٹ مارگریٹ ہے۔ لوگ کھڑے ہو کر ایک دوسرے کے کندھوں کے اوپر سے جھانک کر اس انگریز ساحرہ کو دیکھتے رہے اور پھر شاہد کے پیچھے کھڑے ہوئے رچرڈ موربی نے سب سے پہلے تالیاں بجانا شروع کیا۔ وہ خوش تھا کہ اس کے سکھائے ہوئے فن کو مارگریٹ نے اس خوش اسلوبی سے ادا کیا تھا کہ تماش بینوں کے دیکھنے اور سوچنے کے درمیان کوئی فرق نہیں رہ گیا تھا۔ پورا کلب تالیوں کی گونج میں ڈوب گیا۔ شاہد نے اپنی کرسی سے اٹھ کر اپنے میزبان کو مبارک باد دی۔

مسٹر موربی، آپ واقعی ایک بہت بڑے فن کار ہیں۔ شاہد نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے گرم جوشی سے کہا۔

"شکریہ۔ تم جب مارگریٹ کا ایکٹ دیکھ رہے تھے تو تمہیں اپنے وطن کی یاد تو نہیں آئی، یا اپنی ماں کے اس خط کی جو آج صبح تمہیں ملا تھا، یا چچا کی اُس اُنگلی کی جو تمہیں قصوروار ٹھیراتی تھی؟" رچرڈ موربی نے پُوچھا۔

"نہیں موربی صاحب ——— میں تو سو فی صد آپ کے کلب میں تھا اور مارگریٹ کے جادو سے ایک بُت بن گیا تھا۔ یہاں تک کہ میں نے اپنی نئی دوست، ہیلن کو بھی نہیں دیکھا ——— جو اس وقت اس خالی جگہ کو گھور رہی ہے، جہاں سے مارگریٹ نے اپنا ایکٹ ختم کرنے کے بعد کپڑے

اُٹھائے تھے۔ میرے خیال میں یہ ہیلن آپ کو بہت چاہتی ہے۔" شاہد نے
رازدارانہ طور پر کہا۔

"جہاں کام کرتے ہو اور جس جگہ رہتے ہو، وہاں کبھی عشق نہ کرنا ——
الجھنیں بڑھ جاتی ہیں —— یہ پروگرام تو رات کے چار بجے تک چلتا رہے گا۔
تمہیں رچمنڈ جانا ہے۔ وہ سوہو سے بہت دُور ہے۔ تم کچھ دیر اور ٹھیر گئے تو آخری
بس بھی نہیں مِلے گی —— مگر مہربانی کر کے یہ نہ سمجھنا کہ میں تم سے جانے
کے لئے کہہ رہا ہوں۔ مجھے تو تم پسند ہو، کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ تھرماس تم
نے نہیں توڑا تھا۔" یہ کہہ کر رچرڈ موربی خود ہنسنے لگا۔ ہر اچھی دوستی کے پیچھے چھوٹے
چھوٹے خفیہ اشارے یا مذاق چھُپے رہتے ہیں۔ ان دونوں کو ہنستا دیکھ کر ہیلن اس
ہندوستانی نوجوان کو دیکھنے لگی جس کی اس کے اپنے محبوب سے اتنی اچھی دوستی ہو گئی تھی۔

بہت سے لوگ غالباً صرف مارگریٹ کا ایکٹ دیکھنے کے لئے ہی وینس کلب
آئے تھے۔ وہ بھی اب باہر جانے کے لئے روزی کے کاؤنٹر کے پاس اپنے اپنے اوورکوٹ
کے انتظار میں کھڑے تھے۔ شاہد کو اس کا کوٹ بغیر مانگے ہوئے ہی مِل گیا اور جب وہ
روزی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس کے لمبے سُنہری بالوں کو جھولتے ہوئے دیکھ رہا تھا
تو سوچ رہا تھا کہ پہلی بار اسٹیج سے سب لوگوں کے سامنے اپنے لباس کے بٹن کھولتے
ہوئے وہ کیوں اتنی زیادہ نروس ہو گئی تھی۔ آج رات کو اس کی آنکھیں بے باک لگ
رہی تھیں اور چہرہ نڈر۔ شاید لباس آدمی کو نڈر بنا دیتا ہے۔

شاہد تم آئے —— اچھا کیا۔ تمہیں ہمارا پروگرام پسند آیا ——
یہ اور بھی اچھا ہوا۔" رچرڈ موربی نے شاہد کے پُر خلوص شکریے کے جواب میں ہاتھ
ہلاتے ہوئے کہا۔ "مگر آج صرف پہلی بار اس کلب میں تم میرے مہمان تھے۔ اگلی بار

آؤ گے تو تمہیں خرچ کرنا پڑے گا۔ اور یہ بھی سُن لو کہ میرا یہ کلب حد سے زیادہ مہنگا ہے۔"
"میں آپ کا اشارہ سمجھ گیا۔ مجھے آپ سے ملنا ہو گا تو میں پھر آپ کی بڑی کار کے سامنے کُود جاؤں گا۔" شاہد نے ہنس کر رچرڈ موربی سے کہا۔ اور جب وہ باہر ڈین اسٹریٹ میں آیا تو بارش ہو رہی تھی، مگر اکیس برس کا وہ اُونچے قد کا دربان بھیگے ہوئے فٹ پاتھ پر ایک ہاتھ میں، بڑی، کالی، کھُلی ہوئی چھتری پکڑے اپنی جگہ کھڑا تھا اور سامنے کے چرچ سے لمبا کالا چوغہ پہنے ہوئے ایک موٹا سا انگریز پادری نکل رہا تھا اور اس کوشش میں تھا کہ شاہد سے اس کی آنکھیں چار نہ ہوں۔

اُس رات کے کوئی مہینہ بھر بعد ایک سہ پہر کو شاہد رچمنڈ میں اپنے گھر کے قریب اتفاق سے اسی سنسان سی سڑک سے گزر رہا تھا جہاں رچرڈ موربی سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ آج سورج نہیں نکلا تھا اور بادل پھر گیلے گیلے، بھاری بھاری، کالے کالے اور افسردہ سے تھے۔ کافی دیر سے بوندا باندی ہو رہی تھی جس کی وجہ سے سڑک، مکانوں کی چھتیں، فٹ پاتھ کے کنارے کھڑی ہوئی کاریں، سب ہی بھیگے ہوئے تھے۔ آج شاہد اُداس تھا کیوں کہ اس کی ماں نے لکھا تھا کہ ہسپتال میں اس کے چچا کا انتقال ہو گیا تھا۔ اپنی زندگی کے سب ہی دُکھوں اور ناکامیوں کے لئے اب تک شاہد چچا جان کو قصور وار ٹھیراتا تھا۔ آج یہ رشتہ ٹوٹ چکا تھا اور شاہد کو کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اپنا راستہ بھُول چکا ہے۔

شاہد نے دیکھا کہ اس کے سامنے سے ایک لڑکی ہلکے پیلے رنگ کی برساتی پہنے اسکول کی چھوٹی بچیوں کی طرح سر نیوڑھائے پانی میں بھیگتی چلی آ رہی تھی۔ جب وہ شاہد کے بہت قریب سے گزری تو دونوں کی نگاہیں ملیں اور شاہد کو اچانک وینس کلب کی وہ رات یاد آ گئی، جب ان ہی دو آنکھوں کی نیلی مقناطیسیت میں ڈوب کر

بارش نے تاریک سہ پہر کو اور زیادہ دھندلا دیا تھا۔ شاہد سوچ رہا تھا کہ چچا جان وراثت میں اس کو غالباً اپنا ریوالور دے گئے ہیں۔ چچا جان سے شاہد اپنا رشتہ کبھی نہ توڑ سکے گا ——— شاہد کو اچانک طاہرہ کی یاد نے آگھیرا ——— دو بڑی بڑی کالی آنکھیں شاہد کو بہت قریب سے دیکھ رہی تھیں ——— محبّت کرنے والی ہمدرد آنکھیں۔